عبد السّلام قدوائی

مسلمان اور وقت کے تقاضے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

مسلمان اور وقت کے تقاضے

مولانا عبد السلام قدوائی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

پہلی بار دسمبر ۱۹۷۶ء قیمت ۸/-

(نعمانی پرنٹنگ پریس دہلی ۶)

پیش لفظ

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

اس سے پہلے مکتبہ جامعہ سے میرے مضامین کا ایک مجموعہ" دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اب اس سلسلے کی دوسری جلد پیش خدمت ہے۔ ان مضامین میں کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان حالات کا اندازہ کریں۔ وقت کے تقاضے کو سمجھیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے آشنا اور قرآنی ہدایات سے باخبر ہوں پھر حسنِ اخلاق اور عملِ صالح کی تاثیر سے واقف ہوں اور اسلاف کے دلکش مرقعوں سے اپنی زندگی کو اس طرح آراستہ کریں کہ دوسروں کے دلوں میں اُن کے لیے گنجایش پیدا ہو اور محبوب خدا کے اُمتی محبوب عالم بن جائیں۔

اس جلد کی اشاعت بھی جناب شاہد علی خاں جنرل مینجر مکتبہ جامعہ کی توجہ سے ہو رہی ہے۔ اگر پڑھنے والوں کو یہ مضامین مفید معلوم ہوں تو اُنھیں شاہد صاحب کا ممنون و شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُنھیں کی بدولت یہ منتشر مضامین مرتب شکل میں ان کے سامنے آسکے۔ فقط

عبد السلام
دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۵ر فروری ۷۶ء

فہرست مضامین

مسلمانوں کے لیے راہِ عمل

"ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکالکر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگی سے نجات دے کر وسعت و کشائش کی راہ دکھائیں۔ ظلم و جور سے بچا کر عدل و انصاف کی فضا میں لائیں۔ بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ان کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہیے۔ ہماری نظر میں انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ ہم انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تمام آدمیوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں سمجھتے ہیں اور سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ ملک گیری اور کشور کشائی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے آئے ہیں۔ اگر ہماری بات مان لی جائے تو ہم واپس لوٹ جائیں گے۔"

مذکورہ بالا الفاظ میں عرب قاصدوں نے امرائے ایران اور شاہِ ایران کے سامنے اپنے مقاصد پیش کیے۔ یہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے مبارک عہد کا واقعہ ہے۔ مسلمان جب سرزمین عرب سے باہر نکلے اور روما و ایران کی حدود میں داخل ہوئے تو ان کے دلوں میں یہی پاک خیالات تھے اور وہ نوعِ انسانی کی خیر خواہی و ہمدردی کے غیر معمولی جذبات اپنے سینوں کے اندر رکھتے تھے۔ ملکوں کا فتح کرنا، سلطنتیں قائم کرنی، مال و دولت کے انبار لگانے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا اُن کا مقصد نہ تھا۔

درحقیقت وہ نوعِ انسانی کی پریشانیوں سے دلگیر تھے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ ظلم وستم کے مارے ہوئے انسانوں کو امن وسکون اور راحت وآرام نصیب ہو۔ سلاطین وامراء کی چوکھٹوں پر جھکے ہوئے سروں کو اُٹھا کر وہ رب العالمین کے سامنے سربسجود کرنا چاہتے تھے وہ ہر قسم کی مشکلیں عوام الناس کی راہ سے دور کرنا چاہتے تھے۔ اپنی راحت وآرام کا ذرہ برابر بھی خیال نہ تھا بلکہ انکی دلی آرزو تھی کہ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچائیں۔ وہ شاہانہ شکوہ وجبروت سے ناآشنا اور امیرانہ عیش وعشرت سے کوسوں دُور تھے۔ ان کے حکمرانوں کو بادشاہت کا لفظ بھی گوارا نہ تھا۔ وہ موٹا جھوٹا کھا کر اور پھٹا پرانا پہن کر انسانوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ وہ کسی معاملے میں اپنی فوقیت اور ترجیح کے روادار نہ تھے بلکہ ملک کے معمولی سے معمولی باشندے کی ضرورت کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے تھے اور سارے ملک کو کھلا کر خود کم سے کم پر گزر کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شام سے ایک قاصد آیا کھانے کے وقت اس نے دیکھا کہ امیر المومنین کے دسترخوان پر صرف جو کی روٹی ہے۔ یہ منظر اس کے لیے بڑا درد انگیز تھا کہ مسلمانوں کا امیر اس قدر تکلیف اُٹھائے اُس نے عرض کیا آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ کی حدودِ سلطنت میں تو گیہوں کی پیداوار بہت ہے اور آپ آسانی سے گیہوں کی روٹی کھا سکتے ہیں۔ قاصد کی گفتگو سن کر حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا: "بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے۔ اگر مملکت کے تمام لوگ گیہوں کھانے لگیں تو کیا اس سلطنت کے اندر اتنی مقدار میں گیہوں پیدا ہوتے ہیں کہ ہر شخص پیٹ بھر کر گیہوں کی روٹی کھا سکے"۔ یہ سوال سُن کر قاصد چکرا گیا اور کہنے لگا نہیں ہماری حدودِ سلطنت میں تو اتنے گیہوں پیدا نہیں ہوتے ہیں کہ اگر سب باشندے گیہوں ہی کی روٹی کھانا چاہیں تو کھا سکیں۔ قاصد کا جواب سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ پھر جب صورت حال یہ ہے تو میں گیہوں کیسے کھا سکتا ہوں۔ میں تو وہی کھانا چاہتا ہوں جو سب لوگ کھا سکیں"۔

وہ حکومت کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اسے ذمہ داری کا ایسا بارِ گراں

خیال کرتے تھے جس سے ہر دم لرزتے رہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ایک معمولی انسان کی طرح سمجھتے تھے۔ خطبۂ خلافت دینے کھڑے ہوتے تو برسرِ منبر اعلان کرتے کہ میں تمہارا حاکم مقرر کیا گیا ہوں لیکن تم سے بڑھ کر نہیں ہوں۔ جب تک میں قانونِ الٰہی کی پابندی کرتا رہوں تو میرا کہنا مانو اور اگر میں اس راہ سے منحرف ہو جاؤں تو تم پر میرے احکام کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اُن کے یہاں ہر شخص کو اس کا حق تھا کہ اگر وہ خلیفہ کو غلط رَو سمجھے تو بے جھجک ٹوک دے۔ ایک بڑھیا بھی خلیفہ کو متنبہ کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی ایک بدّو برسرِ عام خلیفہ کو ٹوک دیتا تھا اور برملا کہتا تھا کہ اگر تم کج روی اختیار کروگے تو ہم تمہیں سیدھا کر دیں گے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ خلیفہ سے بازپرس کر سکے۔

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ تقریر کر رہے تھے آپ نے فرمایا لوگو! سنو اور مانو، ان الفاظ کو سن کر ایک شخص نے فوراً کہا "ہم تمہاری بات نہ سنیں گے نہ مانیں گے، جو چادریں تقسیم ہوئی ہیں وہ چھوٹی تھیں۔ اس میں کسی طرح تمہارا کُرتا تیار نہ ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کیا بات کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے جسم پر اسی چادر کا بنا ہوا کُرتا ہے۔ آخر اتنا زیادہ کپڑا کہاں سے آیا؟ جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہ ملے گا میں نہ تمہاری بات سنوں گا اور نہ تمہارا کہنا مانوں گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اُٹھے اور اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "تم صحیح کہتے ہو واقعی وہ چادر چھوٹی تھی اور ایک چادر میں امیر المومنین کا کُرتا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے حصے کی چادر بھی امیر المومنین کو دے دی تھی اور دونوں کو ملا کر ان کا یہ کُرتا تیار ہوا ہے۔ یہ سن کر معترض مطمئن ہو گیا اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ فرمایئے اب آپ جو کہیں گے میں اُسے سنوں گا اور جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کروں گا۔

وہ پوری جد و جہد کرتے تھے کہ سارے ملک کے باشندے چین اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ دن اسی فکر میں بیتتے اور راتیں اسی دُھن میں گزرتیں۔

حمص والوں کے ساتھ اُنھوں نے جو برتاؤ کیا وہ آج تک تاریخ اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ ایک موقع پر جنگی حالات نے یہ صورت پیدا کردی کہ مسلمانوں کو اپنی پوری طاقت سمیٹ کر محاذ پر لے جانی پڑی۔ حمص میں حفاظتی محصول وصول کیا جا چکا تھا جب حالات کی نزاکت کی بنا پر مسلمان امیر یہاں سے اپنے تمام سپاہیوں کو لے کر جانے لگا تو اُس نے شہر کے باشندوں کو جو مذہباً عیسائی تھے بلا کر کہا۔ ہم نے تم سے کچھ رقم اس لیے وصول کی تھی کہ تمھاری حفاظت کا انتظام کریں گے۔ لیکن ایسے حالات درپیش ہیں کہ ہمارے لیے تمھاری حفاظت دُشوار ہے۔ اس لیے ساری وصول شدہ رقم تمھیں واپس کر رہے ہیں۔ حمص کے عیسائی باشندوں نے مسلمان امیر کے یہ الفاظ حیرت کے ساتھ سُنے اور کہنے لگے خدا وہ دن جلد لائے کہ آپ لوگ پھر ہمارے شہر میں تشریف لائیں۔

اس قسم کے واقعات اسلامی تاریخوں میں بکثرت موجود ہیں۔ اس مختصر مضمون میں مزید تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لیے چند اشارے کر دیے گئے ہیں۔ صدرِ اول کے مسلمانوں اور خلفاء راشدین کا یہی وہ نقطۂ نظر اور طرزِ عمل تھا جس کی وجہ سے وہ دُنیا کے جس ملک میں گئے وہاں فرشتۂ رحمت سمجھے گئے اور ہر مذہب وملّت کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف پندرہ سولہ سال کے اندر لاکھوں مربع میل زمین اُن کے زیرِ اثر ہو گئی۔ لوگوں کے دل ان کی محبت وعقیدت سے لبریز ہو گئے اور اُنھوں نے دل وجان سے اس عادلانہ نظامِ حیات کو قبول کر لیا اور ان کی زندگیاں اسلامی رنگ میں رنگ گئیں۔ گنتی کے چند برسوں میں اس عظیم الشان کامیابی کی نظیر تاریخِ عالم میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

لیکن ہندوستان کے مسلمان فاتحین کے اندر خلفاء راشدین کے عہد کی یہ روح موجود نہ تھی۔ وہ سرزمینِ ہند میں اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنے کا جذبہ لے کر داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ ملک گیری اور کشورکشائی کے جذبہ سے آئے تھے۔ اصلاحی مقاصد بہت کم ان کے پیشِ نظر

تھے۔ انسانی مساوات کا ان کی زندگی میں کہیں عکس مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ جمہور کی رضامندی کے بجائے خاندانی وراثت ان کا دستورِ حکومت تھا اور سلطنت عموماً جائداد کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور اسلام کا کلمہ اپنی زبان سے ادا کرتے تھے۔ لیکن اسلام ان کی زندگی کا ایک نجی معاملہ تھا۔ بہترین حکمرانوں نے بھی اسلام کے اجتماعی نظام کو نافذ کرنے کی فکر نہیں کی اور جمہور کو کبھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنی رائے سے اپنے حکمران منتخب کریں نتیجہ یہ ہوا کہ سات آٹھ سو برس تک مسلمان ہندوستان میں برسرِ اقتدار رہے۔ لیکن یہاں کے باشندوں کو وہ اپنے راجوں مہاراجوں کی طرح نظر آئے۔ وہی اقتدار لپندی، وہی طمطراق، وہی جاہ وحشمت، وہی شان وشکوہ، وہی مطلق العنانی اور وہی عیش پرستی مسلمان بادشاہوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ حق پسند زبانیں اکثر خاموش رہیں۔ اگر کسی نے کلمۂ حق زبان پر لانے کی جرأت کی تو اسے پہلے اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑا۔

سلاطین ہند کے اس طرزِ عمل نے اسلامی نظام اور اسلامی زندگی کا دل کش مرقع اہلِ ہند کے سامنے نہ آنے دیا۔ ان حکمرانوں کا طرزِ عمل اسلام کے لیے ایک حجاب بن گیا اور اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کو یقین ہو گیا کہ صرف نام اور تمدن و معاشرت کے فرق کے علاوہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ مسلمان حاکموں کے برتاؤ کو دیکھ کر انھیں اسلام سے بدظنی ہو گئی اور ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ اسلام نوعِ انسانی کے مصائب و مشکلات کا علاج نہیں بلکہ غلامی کا ایک نیا پھندا ہے اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ اسلام کے بھی دشمن ہو گئے۔

سلاطینِ ہند کے حالات اور ان کے دورِ حکومت کے واقعات کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف ناظرین کی توجہ اس جانب منعطف کرانی ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں اور امیروں کا طرزِ عمل بہت کچھ غیر مسلموں کے لیے اسلام تک پہنچنے کی راہ روکتا رہا۔ ورنہ سات آٹھ سو برس تو بہت بڑی مدت ہوتی ہے۔ صدرِ اول کے مسلمانوں کو اس میں آنے کا

موقع ملتا تو سات آٹھ برس میں یہاں اسلام کی ایسی لازوال عمارت قائم ہو جاتی جو کبھی متزلزل نہ ہو سکتی۔

کئی سو برس تک زمام اقتدار ہاتھ میں رہنے کے بعد آخر کار ہندوستان سے مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جو کچھ ہوا اس کی داستانِ غم اوراق تاریخ میں درج ہے۔ آج بھی دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ اس محرومی کا سبب اپنی کوتاہی غفلت، نااہلی اور بدعملی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں زمامِ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ کچھ دنوں مسلمانوں کی بادشاہت کا نام باقی رہا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ نام بھی ختم ہو گیا اور پورے طور پر انگریزی حکومت قائم ہو گئی حالات کا یہ بڑا انقلاب تھا جو کبھی حاکم تھے وہ محکوم بن گئے۔

مسلمانوں کو اپنے اقتدار کے زوال کا بے حد صدمہ ہوا۔ اُنھوں نے اس پر دردناک مرثیے لکھے اور عظمتِ رفتہ کے غم میں مدتوں خون کے آنسو روتے رہے لیکن اب بھی ان کی توجہ اصل سبب کی طرف نہیں ہوئی۔ ان کے دل میں صرف یہ ارمان تھا کہ آباد و اجداد کی عزت پھر حاصل کریں اور وہی اقتدار پھر اُنھیں نصیب ہو جائے جو کبھی اُن کے بزرگوں کو حاصل تھا۔ اس دور کے لٹریچر میں آپ کو یہ روح ہر جگہ کارفرما نظر آئے گی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوّے برس تک کا زمانہ تقریباً اسی حال میں گزر گیا۔ یعنی عظمتِ ماضی کو یاد کر کے رونا اور یہ تمنا کہ کسی طرح پھر وہی دورِ عروج واپس آ جائے۔ اس اثنا میں اسلام پر سیکڑوں معترضانہ کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان تحریروں میں اسلامی نظامِ حیات کی خوبیاں واضح کی گئیں۔ انسانی مساوات کی دلآویزی کی مثالیں تاریخ اسلام سے نقل کی گئیں اور خلفاء راشدین کی سادگی، اخلاص، خدمت بے غرضی اور ایثار کے بڑے پُراسرار واقعات بیان کیے گئے۔ لیکن مسلمانوں کا عام طرزِ عمل اس کے برعکس ہی رہا اور "مسلمانی درکتاب اور مسلمانان درگور" کی مثال عام طور سے صادق آتی

رہی۔ ایک طرف مسلمانوں کا طرزِ عمل عموماً غیر مسلموں کو صحیح اسلام سے متعارف کرنے میں، دوسری طرف غیر مسلموں کے دلوں میں سابق حکمرانوں کے خلاف ناگواری موجود تھی۔ انگریزی حکومت بھی ایسی ترکیبیں کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس ناگواری میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مسلمان سلاطین کے خلاف کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ رسالوں میں اُنھیں بدنام کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو قومی عصبیت کی بنا پر یہ امور ناگوار ہوئے۔ اُنھوں نے بھی اس کے جواب میں مضامین لکھے اور کتابیں شائع کیں۔ اس کی وجہ سے تاریخی ناگواری ان کی جانب منتقل ہو گئی۔ تاریخ میں صحیح یا غلط جو بھی باتیں مسلمان بادشاہوں کے متعلق درج کی جاتی تھیں غیر مسلم اُنھیں بالکل صحیح سمجھ لیتے تھے اور موجودہ مسلمانوں کو سابق مسلمانوں کا جانشین سمجھ کر ان سے ان کے بزرگوں کے مفروضہ مظالم کا انتقام لینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ صورتِ حال خود ہی فضا کو تلخ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ محض اظہارِ اقتدار کی خاطر روزمرّہ کی زندگی میں تقریبوں میں، تیوہاروں میں، میلوں میں اور عرسوں میں مناقشات پیدا ہوتے تھے۔ مسلمان اگرچہ حاکمانہ طاقت نہیں رکھتے تھے اور ہندوؤں کی طرح انگریزوں کے محکوم تھے۔ لیکن چونکہ ان کی حکومت کے خاتمہ کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا، اس لیے حاکمانہ احساس فنا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہندوؤں کو جو بعض حیثیتوں سے ان سے زیادہ صاحبِ اثر ہو چکے تھے۔ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وقتاً فوقتاً تصادم کی نوبت آ جاتی تھی۔ ہندوؤں کے دل میں بھی تاریخی کتابوں کے رطب و یابس روایات کی بنا پر مسلمانوں کے خلاف تنفر موجود تھا۔ اس لیے وہ بھی مسلمانوں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے اور آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اگر آپ ان جھگڑوں کی تفصیل پر غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ گو ان جھگڑوں میں مذہب کا نام لے کر ہنگامے برپا کیے گئے۔ لیکن اُنھیں مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جلوسوں کے گزرنے میلوں کے منعقد کرنے، تعزیوں کے گشت اور اسی طرح کے دوسرے معاملات عموماً باعثِ نزاع ہوتے تھے۔ جنھیں یہی نہیں کہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مذہب

ان باتوں کا مخالف ہے۔

اگر مسلمان حقیقی طور پر اپنے مذہب کے پیرو ہوتے، ان کی انفرادی زندگی بھی اسلام کی چلتی پھرتی تصویر ہوتی اور ان کی اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کی اعلیٰ اخلاقی صفات کا اظہار ہوتا تو ان کے خلاف ناگواری میں کمی ہوتی اور تجربہ کے بعد جب غیر مسلموں کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کا وجود ان کے لیے مفید ہے اور مسلمانوں کے ساتھ رہ کر انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ بے شمار فوائد پہنچتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کی مخالفت ختم ہو جاتی اور وہ دل وجان سے مسلمانوں کے ہمدرد اور ہمنوا بن جاتے۔ لیکن چونکہ عام طور سے مسلمان اسلام کی تعلیم سے گہرا عملی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اپنے مناقشات میں اسلام کا نام غلط طور پر لیتے رہتے تھے اس لیے غیر مسلموں کے دلوں میں قدرتی طور پر مسلمانوں کے ساتھ اسلام کے خلاف بھی دشمنی پیدا ہو گئی۔ حالات اسی طرح آگے بڑھتے رہے اور ناگواریوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

انگریزی عہد کے نوّے برس یوں ہی گزر گئے، مسلمان اپنے محکوموں کے برابر ہو گئے تھے۔ بلکہ بعض اعتبارات سے ان سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی سمجھ میں اب بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ واقعی وہ اپنے گذشتہ محکوموں کے برابر ہو گئے ہیں۔ وہ فلک کج رفتار کا شکوہ کرتے، زمانے کی نیرنگی کو برا بھلا کہتے، طالع ناسازگار کی شکایت کرتے۔ لیکن حقائق کو سمجھ کر اپنی کوتاہی کی تلافی کا انھیں زیادہ خیال نہ آتا تھا بہرحال نوّے برس کا یہ دور گزر گیا اور ۱۹۴۷ء سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے آغاز سے پہلے ایک طویل کشمکش کا سلسلہ جاری رہا اس کشمکش نے تاریخ کی پرانی ناگواریوں کو سیکڑوں گنا زیادہ کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوستان اپنی وسعت کے باوجود دونوں قوموں کے لیے تنگ ہو گیا۔ بالآخر ملک تقسیم ہوا۔ اس تقسیم نے ناگواریوں کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ اس کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمان ایک ایسی اقلیت کی طرح ہیں جس سے

اکثریت کو ناگواری بھی ہے اور بے اعتمادی بھی۔ مسلمان افسردہ اور پریشان خاطر ہیں۔ ان کے متعلق جو ناگواری ہے وہ صرف انھیں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس مذہب سے بھی نفرت ہے جس کے وہ نام لیوا ہیں۔ اس وقت تک غنیمت یہ ہے کہ دستورِ حکومت میں کوئی بات نہیں جو مسلمانوں کے خلاف ہو، یعنی ہندوستان کے آئینِ حکومت کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قانوناً ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یکساں حقوق رکھتے ہیں، شہری زندگی میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ قانوناً ترقی کے مواقع سب کو دیے گئے ہیں۔ موجودہ حکمراں پارٹی بھی اپنے قانون اور دستورالعمل کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتی ہے۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے غنیمت ہے ورنہ فضا میں وقتاً فوقتاً زیادہ خطرناک آوازیں آتی رہتی ہیں ابھی تک اس قسم کے علی الاعلان متعصب گروہوں کو ملک کے نظامِ حکومت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن ملک میں ان کی آوازیں سنائی ضرور دیتی ہیں، اگر ان جماعتوں کو فروغ حاصل ہوا تو وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت برقرار نہیں رکھیں گے۔ ابھی تک آئینِ حکومت کے مطابق غیر مسلموں کے مساوی ہیں۔ لیکن متعصب فرقہ وارانہ جماعتوں کے ہاتھوں میں اگر نظامِ حکومت آگیا تو پھر مسلمان قانوناً بھی مساوی حقوق محروم سے ہو جائیں گے اور ان کی حیثیت ایک طاقتور متعصب اکثریت کے نیچے دبی ہوئی اقلیت کی ہو جانے گی جسے نہ عملاً ترقی کا کوئی موقع حاصل ہوگا نہ قانوناً۔

اس صورتِ حال کو روکنے کے لیے مسلمانوں کو بڑی ہمت، بڑے استقلال اور بڑی دانشمندی سے کام کرنا پڑے گا۔ تاریخ میں یہ تدریجی انحطاط جو انھیں منزل بہ منزل پیش آتا گیا ہے۔ اس کا انھیں گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا اور جذبات اور تمناؤں کے بجائے عقل اور تجربات کی روشنی میں اپنے لیے راہِ عمل بنانی پڑے گی، سیاست مذہبی حقائق کی طرح کوئی اٹل چیز نہیں ہے بلکہ حالات کے مطابق طرزِ عمل ضروری ہے۔ جذبات خواہ کتنے ہی خوش گوار کیوں نہ ہوں۔ لیکن ان کے دھارے میں بہنا صحیح نہیں ہے بلکہ عقل کی

روشنی اور تجربات کی رہبری میں قدم اُٹھانے چاہییں۔ تہذیب اور رسم و رواج بھی دائمی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ وہ بھی حالات کی بنا پر بنتے اور بدلتے ہیں۔ یہی حال بہت سے زندگی کے اطوار اور آداب کا ہے ان حقائق پر مسلمانوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو اپنی رہنمائی کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے جو حالات کو صحیح طور سے سمجھنے والے ہوں جن کا ذہن تنگ اور نقطۂ نظر فرقہ وارانہ نہ ہو جن کی سیرت مضبوط، اخلاق بلند، اور زندگی بے داغ ہو۔ اسلام کی اعلا قدریں ان کی زندگی سے نمایاں ہوں پھر وہ گمنام نہ ہوں بلکہ سارے ملک میں متعارف ہوں اور ایک حد تک بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوں۔ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے اسلام کا نام استعمال نہ کیا جائے بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اپنے ملکی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے مذہب کو اختلاف اور مخاصمت کے رنگ میں کبھی نہ پیش کیا جائے۔ بلکہ اس طور پر سامنے لایا جائے کہ غیر مسلم اسلام کو نوعِ انسانی کے لیے پیامِ رحمت سمجھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست اور مصلحت کا تابع کیا جائے۔ یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ مذہب کے اصولوں میں قطع و برید کی جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ جس طرح زمانۂ سابق میں مذہب کو ایک مفید تحریک اور انسانیت کے لیے امن و سکون کا باعث ظاہر کرنے کے بجائے ایک اختلافی اور نزاعی معاملہ بنا دیا گیا تھا اور اپنے جھگڑوں میں کھینچ کر مذہب کو لایا جاتا تھا اب ایسا نہ ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے اندر صبر و ضبط، تحمل و برداشت کی عادت پیدا کرنا چاہیے۔ ان کے اندر اسلام کی حقیقی روح کو بیدار کرنے کی جد و جہد کی جائے۔ تاکہ ان کا مذہب انسانیت کی خدمت کا بہترین ذریعہ سمجھا جائے۔ لوگ مسلمان کو بہترین رفیق، بہترین پڑوسی، بہترین مشیر، بہترین غم گسار اور بہترین معین و مددگار سمجھیں، وہ اپنے اخلاق سے غیر مسلموں کے دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد جب سلاطین اسلام کی زندگی اصولوں کے مطابق

باقی نہیں رہی تو بہت سے اللہ کے مخلص بندوں نے ایک روحانی نظام قائم کیا۔ یہ حضرات اسلامی تعلیم کے سچے نمونے تیار کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں زمین کی حکومت نہ تھی لیکن یہ لوگ دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا نظام طاقت پر قائم نہ تھا۔ بلکہ محبت و عقیدت اور شفقت وخدمت کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔ ان کی تنظیم سلطنتوں کی تنظیم سے زیادہ مستحکم دیرپا اور اثر انگیز تھی۔ مسلمان حکمرانوں کی بے راہ روی کی روک تھام بھی ان بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ ہوتی رہتی تھی۔ مطلق العنان سلاطین ان بزرگوں کی روحانی طاقت کے سامنے لبسا اوقات سپر انگندہ ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف غیر مسلموں کو بھی اسلامی تعلیمات کا جلوہ انسانی زندگی میں دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور وہ اسلام کے جمالِ دل کش سے متاثر ہوتے تھے اور اپنا سرِ نیاز اس کے آستانہ پر جھکا دیتے تھے۔ یہ صوفیائے کرام کا مقدس گروہ تھا۔ ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ نظام الدینؒ حضرت نصیر الدینؒ چراغ دہلی، حضرت علاؤالدین صابرؒ، حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ حضرت سید گیسو درازؒ وغیرہ بہت سے بزرگوں نے اپنی زندگی کے دل کش نمونے دکھا کر اہلِ ہند کو گرویدہ کر لیا تھا۔ آج کل ذکر و فکر کے آستانے سونے پڑے ہیں ہمیں ان کو پھر سے آباد کرنا چاہیے۔

اسی کے ساتھ اسلام کی صحیح تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرنے کے لیے درس و تدریس کے حلقے جا بجا قائم کرنے چاہییں۔ تاکہ مسلمانوں کو کتاب وسنت کی صحیح تعلیم دی جاسکے اور وہ بدعات وخرافات کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔ عقلی طور پر بھی اسلامی تعلیمات کے فضائل ومحاسن سے واقف ہوں۔ زندگی کی تیرہ وتار راہوں میں اسلام کی شمع ہدایت سے خود بھی رہنمائی حاصل کر سکیں اور دوسروں کو بھی لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا سکیں۔ اپنے آپ کو متحمل اور روادار بنائیں۔ اپنی بات کہنے کے ساتھ دوسروں کی بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس بات کو صحیح سمجھتے ہوں اس پر خود جمے رہیں لیکن دوسروں کی نیت پر شبہ نہ کریں اور یہ سمجھیں کہ جس طرح ہمیں ایک رائے

قائم کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا حق ہے اسی طرح دوسروں کو بھی حق ہے کہ وہ اپنی فہم وبصیرت سے کوئی رائے قائم کریں۔ اور اس کے مطابق عمل کریں۔ دل آزار تبصروں اور ناگوار تنقیدوں سے سخت پرہیز کریں۔ ہر شخص کا احترام کریں۔ اس طرح مسلسل عمل کرکے اُمید ہے کہ وہ مستقبلِ قریب میں خود بھی اپنی جماعت کو مضبوط کرلیں گے۔ اور دوسری قوموں کو اپنے متعلق ہمدرد اور خیرخواہ بنالیں گے اور اس ملک میں ایک صحیح پُراخلاص اور ہمدردانہ فضا پیدا کردیں گے۔

وقت کا تقاضا

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر صحابۂ کرام سے فرمایا کہ "میں اور قیامت اسی طرح ہیں جس طرح یہ دونوں انگلیاں۔"[1] آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے بعد قیامت تک کوئی اور نہیں آئے گا اور جب تک دنیا قائم ہے میری ہی شریعت نافذ رہے گی۔

اس حقیقت کو ایک اور تمثیل میں اس طرح بیان کیا ہے۔

" ایک شخص نے بہت اچھا خوبصورت مکان بنایا۔ لیکن اس میں ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ لوگ اسے دیکھتے ہیں تو بہت پسند کرتے ہیں۔ مگر (خالی اینٹ کی جگہ دیکھ کر) کہتے ہیں کہ اینٹ بھی کیوں نہیں لگا دی (سن لو کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔"

صحیحین کی ایک اور روایت میں اس کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے :-

" بنی اسرائیل کی رہنمائی میں انبیاء فرمایا کرتے تھے جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہو جاتا تھا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔[2]"

ان ارشادات کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ آئندہ نہ کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے آنے والا ہے نہ کوئی کتاب نازل ہونے والی ہے قرآن مجید میں جو ہدایات دی گئی ہیں انھیں کی روشنی میں ہر دور میں زندگی کے ضابطے

۱۔ صحیح بخاری کتاب المناقب باب خاتم النبیین ۲۔ بخاری مسلم

بنائے جائیں گے۔ قرآنی اصول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے حالات و ضروریات پر منطبق کر کے اُمت کے لئے نمونہ قائم کر دیا۔ خود قرآن مجید ایک دم پوری کتاب کی شکل میں نازل نہیں ہوا۔ بلکہ حوادث و واقعات کے تحت ۲۳ برس کی مدت میں آہستہ آہستہ نازل ہوتا رہا تاکہ ربانی ہدایات کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کا سلیقہ پیدا ہو، اصول سے فروع کے استنباط کی صلاحیت نشوونما پائے۔ حکم و مصالح پر نظر عمیق ہو، احکام الٰہی کے رموز و غوامض ذہن نشین ہوں، علل و اسباب سے واقفیت ہو اور زندگی کے نت نئے مسائل کو اسلام کے لازوال احکام کی روشنی میں حل کرنے کی مشق ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ آپؐ اس کے معنی و مطالب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسبابِ نزول سے تو آپ پورے طور پر باخبر تھے، حکم و مصالح پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔ حال آپؐ کے سامنے تھا مستقبل کا پورا اندازہ تھا، کلام الٰہی کی وسعت و جامعیت پیش نظر تھی زمان و مکان کے تقاضوں سے بھی واقف تھے اور آئندہ کے امکانات بھی سامنے تھے۔ اسلام کے حلقہ بگوشوں کا وہ سیدھا سادا معاشرہ بھی سامنے تھا جو احکام الٰہی کا اولین مخاطب تھا۔ آپؐ اس معاشرے میں قرآن مجید کے لامحدود اصولوں کو زمان و مکان کے حدود کے اندر اس طرح منطبق کرنا چاہتے تھے کہ آپؐ کا جادۂ عمل ہمیشہ نشانِ راہ کا کام دے۔ لیکن اجتہاد کا دروازہ مسدود نہ ہونے پائے۔ اسوۂ نبوی نئی نسلوں کے لیے شمعِ ہدایت ہو لیکن جمود کا باعث نہ بننے پائے۔ نظر اصول پر رہے مگر قدم صراطِ مستقیم سے نہ ہٹنے پائیں قانون محکم ہو مگر جامد نہ ہو۔ اس کی گرفت پختہ ہو مگر نمو کی قوت فنا نہ ہونے پائے۔

یہ کام آسان نہ تھا، بڑا مشکل تھا، لاکھوں آدمیوں کی رواں دواں زندگی میں اسلامی اصول کا اس طرح نفاذ کہ پورا معاشرہ پوری طرح شریعت کے حدود کے اندر ہو۔ زمان و مکان کی رعایت پیش نظر رہے۔ احکام میں اس وقت کے لوگوں

کے حالات اور ضروریات کا لحاظ رہے مگر مستقبل کی طرف سے بھی غفلت نہ ہو اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ آئندہ نسلوں کے لیے دشواری کا باعث ہو۔ لوگ بعض اوقات کچھ سوالات کرتے تھے۔ یہ سوالات ظاہر ہے کہ لوگ اپنی فہم اور اپنے ماحول اور معاشرے کے مطابق کرتے تھے اور رسولؐ کی طرف سے جو جواب دیا جاتا اس کی حیثیت مستقل ہوتی اور جب عرب کا وہ سارا ماحول بدلتا تو یہ جواب دوسری نسلوں کے لیے مشکلات کا باعث ہوتے اس لیے قرآن مجید میں بار بار سوالات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لا تسئلوا رسولکم کما سُئِلَ موسی من قبل لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسوءکم	اپنے رسول سے اس طرح سوال نہ کرو جس طرح اس سے پہلے حضرت موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے۔ ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر تمھارے لیے ظاہر کر دیا جائے تو تم کو بُرا لگے۔

اس مفہوم کی متعدد آیتیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑی شدت سے اس کی ممانعت کی ہے۔ ایک موقع پر اللہ تعالیٰ جن باتوں کو پسند کرتا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

یکرہ لکم قیل و قال وکثرۃ السوال	وہ تمھارے لیے قیل وقال اور کثرتِ سوال کو ناپسند کرتا ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:۔

دعونی ما ترکتکم انما اھلک من کان قبلکم کثرۃ سؤالھم [۲]	جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں تم مجھے چھوڑے رہو۔ تم سے پہلے کے لوگوں کو سوال کی کثرت نے ہلاک کر دیا۔

آپ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ جو ضروری بات ہوگی وہ میں بتا دوں گا۔ تم اپنی طرف سے سوالات نہ کرو۔ کیونکہ اس طرح بہت سی غیر ضروری باتیں شریعت میں داخل ہو جائیں گی جو بعد کے لوگوں کے لیے دشواری کا باعث ہوں گی۔ مثلاً ایک مرتبہ

آپ حج کا ذکر کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کیا ہر سال یا رسول اللہ آپ خاموش رہے لیکن جب اس نے تین بار اپنا سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں تو (ہر سال) واجب ہو جاتا اور تم اسے نہ کر سکتے۔ پس جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں تم مجھے چھوڑے رہو یعنی جب تک میں تم سے کچھ نہ کہوں تم کوئی سوال نہ کرو۔ پھر آپؐ نے فرمایا جب میں کسی بات کا حکم دوں تو حتی المقدور اسے بجا لاؤ اور اگر کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے باز رہو۔

اسی بنا پر صحابہ کرام بہت ہی کم سوال کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ان کے چند سوالات مذکور ہیں۔ جواب میں بڑی جامعیت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مثلاً:۔

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو	وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ (راہِ حق میں) کریں۔ کہہ دیجیے جو تمھاری ضروریات سے فاضل ہو۔
یسئلونک ماذا اُحِلّ لھم قل اُحل لکم الطیبٰت	وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے۔ کہہ دیجیے تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کی گئی ہیں۔
یسئلونک من الروح قل الروح من امر ربی	وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کا حکم ہے

اسی طرح سارے قرآن مجید میں تیرہ چودہ سوال نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے جامع جواب دیے گئے ہیں۔ آنحضرت نے صحابۂ کرام کو سوال کی اتنی ممانعت فرمائی تھی کہ سوال سے اجتناب ان کی مستقل عادت بن گئی تھی۔

قرآن مجید میں مختلف قوموں کے تذکرے ہیں۔ اشیائے کائنات کا ذکر ہے آغاز و انجام کی جانب اشارے ہیں۔ خیر و شر اور جنّت و دوزخ کا بیان ہے۔ لیکن کہیں اس انداز میں نہیں ہے کہ طلبہ ترکِ عقل و ذہن رکھنے والے معاشرے

کو اس کے قبول کرنے میں عقلاً استحالہ نظر آئے۔ چودہ سو برس کی مسلمانوں کی تاریخ موجود ہے کسی ذہنی اور علمی دور میں حقائق قرآنی خلاف عقل و تجربہ نظر نہیں آتے۔ الفاظ کی وسعت و جامعیت اور ان کی گہرائی اور معنویت نے تاویل و تعبیر کی نئی راہیں دکھائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول تاریخ کے ہر دور میں صحیح ثابت ہوا۔

"اس کتاب کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے"

جب حالات بدلیں گے تو ذہن و دماغ کے سانچے بھی بدلیں گے، اس لیے اگر کسی مخصوص زمانے کے ذہن و دماغ، آداب و معاشرت اور تہذیب و تمدن کو سامنے رکھ کر فکر و عمل کا کوئی معیار مقرر کیا جائے گا تو لازمی ہے کہ اس سے مختلف دور میں یہ معیار باقی نہ رکھا جا سکے گا۔ جن مذاہب و ادیان نے اس پر اصرار کیا وہ فنا ہو گئے یا قصہ کہانی بن گئے۔ اس نت نئی بدلتی ہوئی دنیا میں کوئی جامد نظام کس طرح برقرار رہ سکتا ہے۔ وہی آئینِ زندگی اور نظامِ حیات خلعتِ دوام حاصل کر سکتا ہے جس کے اندر لچک اور نمو پذیری ہو، جس کے اصول و مقاصد محکم ہوں مگر ان کو بروے کار لانے کے لیے جو ضابطے بنائے گئے ہوں ان میں زمانے کے تغیّرات اور انسانی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہو اور ہر دور میں مجتہدین کے لیے اجتہاد کے دروازے کھلے رہیں اور نئے حالات میں اصول و کلیات کو نئے جزیات پر منطبق کرنے کی اجازت ہو۔

جن لوگوں کی قرآن مجید کی تاریخ پر نظر ہے اور ہر دور کی تفسیریں جن کے سامنے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر زمانے میں آیات کی کیسی نئی نئی تعبیریں کی گئی ہیں ہر صاحبِ فکر نے اپنی فکر و عقل کے مطابق منشائے ایزدی سمجھنے کی کوشش کی ہے ہر دور کی تفسیر کا رنگ الگ اور ہر مفسّر کا مذاق جدا ہے۔ ابتدائی تفسیری روایتیں پڑھیے تو ان کے اندر نہ علمی مباحث ہیں نہ عملی موشگافیاں۔ سادہ مزاج عرب سادہ زبان اور بے تکلف انداز میں مشکل الفاظ کے معانی بیان کرتے ہیں اور پیچیدہ جملوں کو واضح کرتے ہیں۔ آگے بڑھیے تو آیات و قصص قرآنی کی توضیح میں اہلِ کتاب

کے بیانات اور اسرائیلی روایات کا انبار نظر آتا ہے جن کے اندر قرآن مجید کی واقعیت اور صداقت گم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا تھا اور اس کے متعلق شدید ناگواری کا اظہار فرمایا تھا۔

اس ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہماری تفسیریں، حدیث کی شرحیں، تاریخ وسیر کی کتابیں سبھی اسرائیلی روایات سے پُر ہیں اور ہر جگہ حقائق پر خرافات کے ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو اُٹھا کر حقیقت کا مشاہدہ بہت دشوار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ آپؐ اجمال کی، ضرورت سے زیادہ تفصیل پسند نہیں فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان صحیح احادیث کی تعداد بہت کم ہے جن میں آیاتِ الٰہی کی تشریح کی گئی ہے۔ صحیح بخاری ہی میں کتاب التفسیر دیکھ لیجیے۔ خالص مرفوع روایات چند صفحات سے زیادہ نہیں ہیں، باقی الفاظ کے معانی اور صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے وضاحتی بیانات ہیں۔

آگے چل کر رومی و ایرانی تمدن اور یونانی فلسفہ و حکمت کا دور آیا تو اس عہد کی تفسیروں میں رائج علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا اثر صاف نظر آتا ہے اس زمانے کے علمی نظریات کی روشنی میں آیتوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ حکماء ہوں یا فلاسفہ، معتزلہ ہوں یا اشارہ، اصحاب ظاہر ہوں یا ارباب باطن، سب اپنے اپنے علوم و تحقیق کے معیار پر قرآن کے معانی و مطالب بیان کر رہے ہیں ابومسلم اصفہانی، جاراللہ زمخشری، ابوالحسن اشعری، فخرالدین رازی اور محی الدین ابن عربی کی تفسیریں پڑھیے اور دیکھیے کہ ایک ہی آیت کی کتنے مختلف طریقوں سے تشریح کی گئی ہے اور الفاظ ربانی کے کیسے کیسے معانی بیان کیے گئے ہیں۔

یہ تو تشریح و تعبیر کا ذکر تھا۔ احکام شریعت کی تاریخ پڑھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قرآن مجید کے احکام کی کتنے مختلف طریقوں سے توجیہہ کی گئی ہے۔ صحابہ کرام کے دور ہی میں فہم و تعبیر کا اختلاف نمایاں تھا۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں غور و فکر کے دائرے میں اور وسعت ہوئی اور ہر صاحبِ نظر نے نئے نئے

اصول بنائے۔ ان ائمہ فقہ نے قرآن مجید، احادیث پاک اور اسلاف کے مسلک کو پیش نظر رکھا اور ان کی روشنی میں قوانین بنائے، لیکن الفاظ قرآنی کی حقیقت، احادیث کی صحت اور اسلاف کے نقطہ نظر کے سمجھنے میں ان کے درمیان بڑا فرق تھا۔ پھر شریعت کا منشا کیا ہے اور زمانے کے حالات پر اسے کس طرح منطبق کیا جائے اس بارے میں بھی وہ مختلف الرائے تھے۔ زبان کے قواعد اور بلاغت کے اصول کی بنا پر بھی مطالعہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ کسی نے اس لفظ کو حقیقت سمجھا کسی نے مجاز، گرامر کے اعتبار سے بھی مطالب مختلف ہو سکتے ہیں۔

خود لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں۔ آیت زیر بحث میں کون سے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس میں غور و فکر اور قرائن سے کام لینا پڑتا ہے اور قدرتاً مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ قواعد صرف و نحو کی وجہ سے بھی بسا اوقات ایک جملے کا مطلب کئی طرح سے سمجھا جاتا ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں اس پہلو کی جانب بھی توجہ کی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جن میں جمل اور البحر المحیط بہت مشہور ہیں۔

روایت کی صحت و ضعف کے معیار بھی مختلف ہیں۔ ایک راوی ایک مجتہد کے نزدیک ثقہ ہے۔ لیکن دوسرے کے نزدیک وہی غیر معتبر ہے۔ وقت اور موقع محل کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ راوی نے یہ بات کب اور کس ماحول میں کہی ہے اس کا عمومی پہلو اہمیت رکھتا ہے یا خصوصی۔ یہ اور اسی قسم کی بے شمار باتیں پیش نظر رکھنی ہوتی ہیں۔ چند مثالیں وضاحت کے لیے پیش کی جا رہی ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ گھر والوں کے رونے سے مُردہ پر عذاب ہوتا ہے کسی نے حضرت عائشہ رضؓ سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا ایک یہودی کا انتقال ہو گیا تھا اس کے گھر والے رو پیٹ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ رو رہے ہیں اور میت پر عذاب ہو رہا ہے۔ یہ دونوں جملے دو الگ الگ باتیں بتا رہے تھے۔

لیکن سننے والے نے غلط فہمی سے دونوں کو مربوط سمجھ لیا اور رونے کو عذاب کا سبب قرار دیا۔

گرامر کی وجہ سے اختلاف کی ایک مثال کا آپ رمضان میں افطار کے وقت مشاہدہ کرتے ہیں۔ جب سُنّی آفتاب غروب ہوتے ہی افطار کر لیتے ہیں اور شیعہ چند منٹ توقف کرتے ہیں۔ دونوں کا استدلال قرآن مجید کی آیت اَتِمُّوا الصیام اِلی اللیل (روزہ رات تک پورا کرو) سے ہے۔ لیکن اِلٰی، یعنی 'تک' کا کیا مفہوم ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ سُنّی سمجھتے ہیں کہ 'اِلٰی' (تک) سے پہلے کا لفظ اِلٰی کے بعد والے لفظ میں داخل نہیں ہوگا۔ یعنی روزہ رات کے شروع ہوتے ہی پورا ہو جائے گا لیکن شیعہ سمجھتے ہیں کہ روزہ رات کی حدود میں داخل ہوگا، اس اعتبار سے رات شروع ہونے کے افطار کی اجازت ہوگی۔

راوی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کے مختلف وجوہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قبول روایت میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور راوی محمد جعفر عندر ہیں ان کے بارے میں اسماء الرجال کی کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک بار اُنھیں مچھلی کھانے کی خواہش ہوئی، بازار جاکر مچھلی خرید لائے اور بیوی سے کہا کہ اسے پکاؤ۔ بیوی پکانے میں لگ گئیں اور وہ انتظار میں لیٹ گئے۔ بازار کی آمد رفت میں تھک گئے تھے آنکھ لگ گئی۔ بیوی مچھلی پکا کر لائیں تو دیکھا وہ غافل سو رہے ہیں، مذاقاً نیم گرم مچھلی ان کے ہاتھ پر لگائی مگر ان کی آنکھ نہ کھلی۔ اُنھوں نے مچھلی اُٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دی۔ کچھ دیر کے بعد جب محمد بن جعفر بیدار ہوئے تو بیوی سے پوچھا کہ کیا ابھی تک مچھلی تیار نہیں ہوئی ہے۔ اُنھوں نے مذاقاً کہا، ارے تم بھول گئے تم تو کھا کر سوئے تھے۔ اُنھوں نے انکار کیا۔ بیوی نے کہا، اچھا اپنا ہاتھ سونگھو، اُنھوں نے ہاتھ سونگھا تو اُنھیں خیال ہوا کہ شاید کھا چکے ہیں۔

اس واقعہ کی بنا پر بعض ناقد اُنھیں غافل قرار دیتے ہیں اور ایسے غافل کی روایت قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے ناقدین کہتے ہیں اس واقعہ

سے روایت میں ان کی غفلت ثابت نہیں ہوتی اس بنا پر وہ ان کی روایت قبول کرتے ہیں۔

بازار میں کھانا آج کل معیوب نہیں ہے۔ لاکھوں آدمی ہوٹلوں میں کھاتے ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں بازار میں کھانا بے حد معیوب تھا۔ ایسے آدمی کو غیر معتبر سمجھتے تھے۔ اس طرح رواج اور مذاق بدل جانے کی وجہ سے معیارِ اعتبار بدل جاتا ہے۔ اس وجہ سے مجتہد کو رواج اور عرف کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ زمانے کے حالات اور لوگوں کی ضروریات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ بعض چیزیں جائز نہیں ہوتی ہیں لیکن جب حالات ایسے ہو جائیں کہ ان سے بچنا دشوار ہو جائے تو مجبوراً انھیں جائز قرار دینا پڑتا ہے۔ یہ ایک اصول ہے۔

الضرورت تبیح المحظورات — ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں

عموم بلویٰ، یعنی ابتلاءِ عام کی حالت میں ناجائز چیزوں کو جائز قرار دینا پڑتا ہے برسات میں راستے کی چھینٹوں سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے۔ چھوٹی چڑیوں کی بیٹ ناپاک نہیں ہوتی۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی۔

تفصیلِ بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مجتہد کو مسائل کے اخذ و استنباط میں کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اللہ و رسول پر ایمان اور کتاب و سنّت پر اعتقاد و اعتماد کے باوجود مسائل میں کتنا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ جب خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قرآن ایک ہے، ارشاداتِ نبوی فیصلہ کن ہیں تو پھر امّت کے درمیان اتنا عظیم الشان اختلاف کیوں ہے اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔

میرے ایک بزرگ رشتہ دار ایک دن میرے یہاں تشریف لائے۔ اس وقت حدیث کی مشہور کتاب جامع ترمذی کا ترجمہ میز پر رکھا تھا۔ حدیث کا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے، چند دن کے لیے مجھے دے دو۔ میں بھی اسے دیکھوں گا۔ اس کتاب میں چونکہ ائمہ کے اختلافات اور ان کے دلائل بیان

کیے گئے ہیں اور یہ باتیں اُن کی فہم سے بالاتر تھیں۔ اس لیے میں نے کتاب کے دینے میں تامّل کیا مگر وہ عمر اور رشتے دونوں میں بڑے تھے، میں اُنھیں روک نہ سکا۔ وہ کتاب لے گئے اور چند دن کے بعد بڑی ناراضگی کی حالت میں آئے اور کہنے لگے مولویوں نے دین کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اللہ ایک، رسول ایک، قرآن ایک، مگر کوئی کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ۔ رسولؐ کی حدیث بیان ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے فلاں یہ کہتا ہے اور فلاں وہ کہتا ہے۔ میں نے اُنھیں سمجھانا چاہا کہ ایمان داری کے ساتھ آیات واحادیث سے مسائل کے استنباط میں اختلاف ہوتا ہے لیکن یہ باتیں اُن کے ذہن و علم کی سطح سے بہت بلند تھیں اس لیے اُنھیں وہ سمجھ نہ پائے اور یہی کہتے رہے کہ دین کو مولویوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اگرچہ یہ ایک شخصی واقعہ ہے مگر اب بھی ہزاروں آدمی یہی خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اصحاب فکر و نظر سمجھتے ہیں کہ مجتہد کو مسائل اخذ کرنے کے لیے کن دشوار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور نتائج میں اختلاف کا ہو جانا ممکن ہی نہیں ناگزیر ہے۔ یہ واقفیت اگر عام ہو جائے تو اُمّت کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان بدظنی دور ہو اور حسن ظن پیدا ہو اور اس کے نتیجے میں رواداری عام ہو جائے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ کسی بڑے سے بڑے مجتہد اور امام کے نتائج تحقیق بے چون وچرا مان لینے کے لائق نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن بنیادوں پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے دوسرے کے نزدیک وہ محلِ نظر ہوں۔ اسی طرح ایک زمانے کی تحقیق ضروری نہیں کہ دوسرے زمانے میں بھی صحیح ہو۔ بہت سی باتیں تھیں جو کسی زمانے میں علم و تحقیق کا شکار سمجھی جاتی تھیں لیکن آج اس قدر لچر اور پوچ سمجھی جاتی ہیں کہ ایک طفلِ مکتب بھی ان کا مذاق اُڑاتا ہے۔ آج کون ہے جو کہے گا کہ زمین ساکن ہے۔ کون عقل اول کے وجود کا قائل ہے کون گردشِ افلاک کو تسلیم کرتا ہے، کون ستاروں کو آسمانوں میں جڑا ہوا سمجھتا ہے کون اس نیلگوں فضا کو ناقابلِ گزر سمجھتا ہے۔ لیکن پرانے اہلِ دانش ان باتوں

پر یقین رکھتے تھے اور اُنھیں تسلیم نہ کرنے والوں کو فاترالعقل خیال کرتے تھے۔ جس زمانے میں ارسطو کا طوطی بولتا تھا اُس زمانے کی تفسیریں دیکھیے کیسی کیسی دلیلیں ان "حقائق" کو ثابت کرنے کے لیے دی ہیں۔ لیکن آج قرآن کا معمولی طالبِ علم بھی رازی جیسے امام فن کی ان باتوں پر مسکراتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے واقعات میں مصر میں ایک قحط کا ذکر آتا ہے۔ قحط ہمارے یہاں بارش نہ ہونے کا نام ہے، اس لیے سورۂ یوسف کی تفسیر میں بے تکلف یہ لکھ دیا گیا کہ سات سال بارش نہ ہوئی پھر اس کے بعد بارش ہوئی۔ لیکن جب جغرافیائی معلومات کی بنیاد پر بعض مستشرقین نے اعتراض کیا کہ مصر میں ایسی بارش کہاں ہوتی ہے جس پر وہاں کی شادابی کا مدار ہو۔ مصر کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے قرآن میں ایسا لکھ دیا گیا ہے تو ذہن الفاظِ قرآنی کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ نظر آیا کہ وہاں سرے سے بارش کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے صرف سبع شداد یعنی سات سخت برسوں کا ذکر ہے پھر کہا گیا ہے

ثم یاتی من بعد ذالک	پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس
عام فیہ یغاث الناس	میں لوگوں کی فریاد سُنی جائے گی۔

لیکن چونکہ ذہنوں میں خشک سالی اور بارش کا تصور تھا اس لیے یُغاث کو غوث کے بجائے غیث سے مشتق سمجھا گیا اور بارش نازل کی جائے گی یا مینہ برسایا جائے گا ترجمہ کر دیا گیا۔

اسی طرح قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں۔ جن کے اپنے اپنے زمانے کے علمی خیالات اور ماحول کے اثرات کی بنا پر ترجمے کیے گئے جو آگے چل کر غلط ثابت ہوئے۔ معترضین نے خوش ہو کر قرآن مجید پر اعتراض کیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعتراض کی زد پُرانے مفسرین پر پڑتی ہے نہ کہ قرآن پر۔ اللہ تعالیٰ مولانا محمد علی مونگیری ناظم اول ندوۃ العلما پر رحمت نازل فرمائے۔ اُنھوں نے کتنے تجربے کی بات کہی ہے:-

"قرآن مجید کو پڑھاتے وقت اس کا خاص خیال رکھیے کہ قرآن مجید کے الفاظ

کیا ہیں اور مفسّرین نے اس سلسلے میں کیا لکھا ہے ۔ مخالفین کے اکثر اعتراضات
قرآن مجید پر نہیں بلکہ مفسّرین کے خیالات پر ہوتے ہیں ۔ اس طرح اگر کسی آیت
سے کئی مفہوم نکلتے ہوں یا کسی لفظ کے کئی معانی ہو سکتے ہوں تو اس معنی کو اختیار
کیجیے جس پر اعتراض ہوتا ہو ۔[۱]

ساری مشکل یہ ہے کہ لوگ عموماً پرانے ائمہ، بزرگانِ دین، فقہاء اور مفسرین
کے اقوال و آراء کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ان کے دائرۂ تقلید سے قدم باہر نکالنا
دین سے انحراف سمجھتے ہیں ۔ ان کی دیانت، ان کی بزرگی اور ان کے علم و کمال میں
ذرہ برابر شک نہیں لیکن زمانہ، حالات علمی تحقیقات اور ماحول کی تبدیلی کی
وجہ سے ان کی بہت سی رائیں اب نظر ثانی کی محتاج ہیں ۔ ان کی دُور بین نگاہوں
نے بہت دور تک دیکھا لیکن ان کی دور بینی کی بھی ایک حد تھی ۔ انھوں نے
آیاتِ الٰہی کا مفہوم متعین کرنے کے لیے بحرِ تحقیق میں بڑی غواصی کی لیکن اعلا درجے
کے فضل و کمال کے باوجود ان کی رسائی محدود تھی نہ وہ عالم الغیب تھے نہ علمِ الٰہی
کا احاطہ ان کے بس میں تھا ۔ اس لیے حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان کے آراء و افکار
میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے ۔

جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں عرض کر چکا ہوں دوام اللہ کی ذات کو ہے
اسی کو مستقبل اور اس کی ضرورتوں کا پورا اندازہ ہے ۔ اسی کے کلام میں یہ صلاحیت
ہے کہ ماضی و حال کی طرح مستقبل کے سوالوں کا بھی جواب دے سکے ۔ اس لیے جب
زمانے کے نئے تقاضے سامنے آئیں تو کسی فتاویٰ کے مجموعہ یا کسی فقیہ کے مرتب کردہ

---

[۱] مولانا محمد علی مونگیری مرحوم سفر میں تھے وہاں سے اپنے نائب حکیم عبد الحیٔ صاحب کو ایک مفصل
خط لکھا ہے جس میں دار العلوم کے نظم و نسق اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بیش بہا ہدایات دی ہیں ۔ یہ
قلمی خط میں نے ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کے ذخیرۂ نوادر میں دیکھا ۔ غالباً اب بھی وہاں محفوظ ہوگا
سارا خط مطالعہ کے لائق ہے ۔

مسائل کی طرف رجوع ہونے کے بجائے کتاب و سنّت پر نظر ڈالی جائے اور محض سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری فکر و بصیرت کے ساتھ ایک ایک لفظ پر غور کیا جائے سنّت نبوی اور آثارِ صحابہ کا مطالعہ کیا جائے۔ اکابر فقہا کے طرزِ تحقیق کو سمجھا جائے اور پوری کد و کاوش کے ساتھ اسلامی اصول کو ان حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح اُمید ہے کہ نورِ اسلام کی شعاعیں عصرِ حاضر کی تاریک راہوں کو منور کر سکیں گی، نشان ہائے منزل نظر آنے لگیں گے اور بھٹکتے ہوئے قدم صحیح سمت کی طرف اُٹھنے لگیں گے۔

لیکن اس کے لیے ایسے اشخاص کی ضرورت ہوگی جو ایک طرف زمانے کے تقاضوں سے باخبر ہوں اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات کے ماخذ پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ ایسے ذی علم اور صاحبِ نظر بہت ہی کمیاب ہیں۔ اس لیے عصری اور اسلامی علوم کے چند ماہروں پر مشتمل ایک تحقیقی مجلس قائم کی جائے علوم جدید کے ماہر زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں اور اسلامی علوم کے ماہران تقاضوں کی روشنی میں اسلامی شریعت کے ماخذوں کا جائزہ لیں، کتابِ الٰہی کی زندہ جاوید آیات پر گہری نظر ڈالیں، ارشادات نبوی کا وسعتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کریں اور منشائے الٰہی اور ہدایاتِ نبوی کی روشنی میں عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

علم کی گہرائی، نظر کی وسعت اور زمانے کے تقاضوں سے باخبری کے ساتھ جرائتِ کردار کی بھی ضرورت ہے۔ تلاش و تفحص اور تفکر و تحقیق کے بعد جس نتیجے پر پہنچیں اسے کھل کر کہنے کی ہمت ہو۔ ائمہ سلف جنھوں نے مشکل حالات میں دین کی سربلندی کی کوشش ہے اور انحطاط پذیر معاشرے کو نئی توانائی عطا کی ہے انھوں نے تقلید پسند عوام اور مصلحت اندیش اور عافیت پسند خواص کی مخالفت کی پروا نہیں کی بلکہ جس بات کو حق سمجھا اسے برسرِ منبر کہا اور اگر اس کی پاداش میں دار و رسن کی نوبت آئی تو بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے اور جلّاد کے سامنے

زبان سے کلمۂ حق نکلتا رہا۔ حجاج بن یوسف کی تلوار سعید بن جبیر کی گردن اُڑا سکی۔ لیکن آخری سانس تک ان کی آوازِ حق کو نہ دبا سکی۔ منصور کے کوڑے امام مالکؒ کی پیٹھ پر برستے رہے مگر ان کی زبان اظہارِ حق سے باز نہ رہی۔ معتصم کا جلال و جبروت امام احمد بن حنبلؒ کو حقیقت کے اظہار سے نہ روک سکا۔ ان کے جسم سے خون کے فوارے بہتے رہے۔ مگر زبان سے وہی نکلتا رہا جسے وہ صحیح سمجھتے تھے جن بزرگوں نے تجدید ملت کی جدوجہد کی ان کو عوام کی ناراضگی اور خواص کی آزردگی سے دوچار ہونا پڑا، دین سے انحراف کے الزام بھی لگائے گئے اور کفر و زندقے کے فتوے بھی دیے گئے۔ ابن رشد ہوں یا ابن تیمیہ غزالی ہوں یا رازی، مجدد سرہندی ہوں یا ولی اللہ دہلوی، اسمٰعیل شہید ہوں یا جمال الدّین افغانی جمود پسندوں اور تقلید پرستوں نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ لیکن وہ بے خوف و خطر حق کی آواز کو بلند کرتے رہے اور ملّت کی اصلاح کے لیے جس راہ کو صحیح سمجھتے تھے اس پر گامزن رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باطل کا شور دب گیا اور حق کا بول بالا ہوا اور دُنیا نے دیکھ لیا۔

فاما الزبد فیذھب جفاء وامّا ماینفع الناس فیمکث فی الارض

جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچاتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔

اسلام کا پیام امن و اتحاد

یہ مضمون اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے
سیمینار منعقدہ ۱۷ تا ۲۰ اکتوبر ۸۱ء (دلی) میں پڑھا گیا

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اس کا مقصد سارے عالم کی فلاح و بہبود ہے۔ اس کی دعوت کسی ملک اور قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ سارے انسان اس کے مخاطب ہیں۔ اس کے پیغمبر کو تاکید کی گئی ہے کہ برملا اعلان کرے

یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً — اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

چنانچہ اس نے صاف صاف کہا۔

بعثت الی الاسود والاحمر — میں کالے اور گورے سبھی کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اس کا رب صرف مسلمانوں کا رب نہیں بلکہ سارے جہانوں کا رب ہے اور اس کا پیغمبر سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

وہ رنگ و نسل اور ملک و قوم کی تفریق کا قایل نہیں ہے وہ ساری نوعِ انسانی کو یکساں سمجھنے اور سب کی فلاح کے لیے جد وجہد کا علم بردار ہے۔ وہ جس طرح خالقِ عالم کی وحدت کا قائل ہے اسی طرح وحدتِ انسانی کا بھی قائل ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ایک ہی مالک کا بندہ اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد سمجھتا ہے۔ جس طرح اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ:

الهکم اله واحد لا اله الا هو الرحمٰن الرحیم

تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اسی طرح اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں اقوام و قبائل کی شکل میں اس لیے کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اس ربانی اعلان کی مزید وضاحت ان الفاظ میں فرمائی۔

انی اشهد ان العباد کلهم اخوة

میں گواہی دیتا ہوں کہ بندے سب کے سب بھائی بھائی ہیں۔

اسی حقیقت کو اپنی تقریر میں اس طرح بیان کیا۔

لا فضل للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی کلکم اولاد آدم وآدم من تراب

نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی کے تھے۔

یہ الفاظ پیغمبر اسلام علیہ السلام نے ایک مجمع عظیم کے سامنے کہے۔ یہ اعلان صرف زبانی ہی نہیں ہوا بلکہ ساری زندگی اس اصول پر عمل کرکے اپنے پیرووں کے سامنے ایسا واضح نمونا قائم کیا کہ انسانیت کی وحدت کا تصور کبھی ان کے ذہن سے نہ نکل سکا بلکہ عالمگیر انسانی برادری ہمیشہ ان کا مطمح نظر رہی۔ اسلام نے جس طرح ملکوں اور قوموں کی تفریق گوارا نہیں کی۔ اسی طرح ذاتوں کی اونچ نیچ بھی تسلیم نہیں کی۔ اس کے نزدیک ذات نہیں بلکہ عمل عزت کا معیار ہے۔ اس نے نہ پیشوں کو خاندانی قرار دیا نہ انھیں شرافت و رزالت کی علامت سمجھا بلکہ ہر شخص کو آزادی دی کہ اپنے حالات

ضروریات، مزاجی مناسبت اور طبعی ذوق کی بنا پر جو پیشہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔ کسی پیشیہ کی وجہ سے وہ شریف یا رذیل نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اپنے اعمال کی بنا پر عزت یا ذلت کا مستحق ہوگا۔

زبانوں کے اختلاف کو بھی اسلام نے تفرقے کی بنیاد نہیں مانا بلکہ اسے قدرتی حالات کا نتیجہ قرار دیا اور افہام وتفہیم کے ذریعے کے سوا اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی، مخاطب کو سمجھانے کے لیے جس زبان یا اسلوب کی ضرورت ہو داعی اسے بغیر کسی تعصب کے اختیار کر سکتا ہے۔

نسل وقوم ملک ووطن اور زبان ورنگ کی طرح مذہبی اختلافات بھی کشت وخون اور قتل وغارت کا باعث تھے۔ لیکن اسلام نے تعصب کی اس فضا میں صبر وتحمل اور رواداری کی تلقین کی اور اعلان کیا کہ

لا اکراہ فی الدین   دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر روا نہیں ہے

اس نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ عقیدہ دل کے یقین کا نام ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنانا ہے تو یہ مقصد زبردستی کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جبر سے زبان بند کی جا سکتی ہے لیکن دل کو قایل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دل کو متاثر کرنے کے لیے بات کو خوش اسلوبی کے ساتھ دل میں اتارنے کی ضرورت ہے اس موقع پر اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی کہ

کل حزب بما لدیھم فرحون   ہر گروہ اپنے خیالات میں مگن ہوتا ہے۔

اس لیے ان کے خیالات معتقدات پر دل آزار طریقے سے تنقید اسے ناگوار ہوتی ہے لہٰذا بحث وگفتگو میں اس کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری بات سے اس کے دل کو ذرا بھی ٹھیس نہ لگنے پائے ورنہ اس کے اندر انقباض کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور معقول سے معقول بات بھی اس پر اثر نہ کرے گی۔ اس لیے خاص طور سے تاکید کی کہ۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ   لوگوں کو اچھی نصیحت اور حکمت کے ذریعہ اپنے

والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن

رب کی طرف بلاؤ اور ان کے ساتھ خوش اسلوبی کے ساتھ بحث کرو۔

اسی کے ساتھ اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی کہ مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور نیکی وبدی کی بنیادی تعلیمات تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ دیانت وامانت، راستبازی ونیک کرداری، عدل وانصاف، ہمدردی وغم گساری، رحم وکرم، احسان وسلوک، صبر واستقامت، عفوو درگزر، ایثار وخدمت، تواضع وحسنِ اخلاق، ایفاء وعدہ وپابندی عہد اور عفت وپاکیزگی وغیرہ فضائل اخلاق پر تمام مذاہب نے زور دیا ہے اور خیانت وبددیانتی، بدعہدی وبے وفائی، ظلم وجور، فریب ودغابازی، کذب وافترا قتل وغارت، بغض وحسد، حرص وطمع اور غرور وانانیت وغیرہ رذائل وقبائح سے اجتناب کی سب نے تاکید کی ہے۔ یہی بنیادی صداقتیں اصل دین ہیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ باقی تفصیلی قواعد وضوابط اور قوانین ورسوم میں زمانے کے حالات مقامی ضروریات، قومی خصائص اور آب وہوا کے فرق کی وجہ سے اختلاف ہے۔ یہ اختلاف ناگزیر ہے۔ لیکن یہ اختلاف اصولی نہیں، فروعی ہے۔ قرآن مجید نے صاف صاف یہ اعلان کیا کہ:

(۱) شرع لکم من الدین ما وصّی به نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیه

تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی (حضرت) ابراہیم (حضرت) موسیٰ وعیسیٰ کو تاکید کی تھی کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

باقی قواعد وضوابط اور رسوم وآئین ہر قوم کے لیے اس کے ماحول اور حالات کی بنا پر علاحدہ علاحدہ مقرر کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہے۔

(۲) لکلٍ جعلنا منکم شرعةً و منهاجا

ہم نے ہر ایک کے لیے ایک دستور العمل اور نظام حیات مقرر کیا ہے۔

دنیا کے ہر حصّے اور ہر قوم میں ہم نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں:

لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ	ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوا ہے۔
مَا مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ	کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا کا خوف دلانے والا نہ آیا ہو۔

قرآن مجید نے ماحول کی مناسبت سے چند مشہور پیغمبروں کے نام لیے اور حالات بیان کیے باقی کی جانب یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ ہر قوم میں خدا کے ہادی آئے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام کا احترام جزو ایمان بنا دیا۔ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں نہیں ہو سکتا جب تک۔ وہ اپنے پیغمبر کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان نہ لائے۔ اسی طرح دوسری کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ جن کتابوں کے ناموں کو قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے ان پر نام کے ساتھ ایمان لایا جائے۔ باقی کے بارے میں یہ یقین کیا جائے کہ خواہ ہم ان کے ناموں سے ناواقف ہوں۔ لیکن خدا کے پیغمبر جب ہر ملک و قوم میں آئے ہیں تو کتابیں بھی ان کے ساتھ بہت سی مختلف زبانوں میں نازل ہوئی ہوں گی۔ سورۂ بقر کی مشہور آیت کے الفاظ ہیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ	رسول بھی اس پر ایمان لائے جو ان پر نازل کیا گیا اور مومنین بھی اس پر ایمان لائے۔ سب اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے (اور یہ کہتے ہیں کہ) ہم اس (اللہ) کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی پیغمبر کو مانا جائے کسی کو نہیں۔ کسی کتاب کو تسلیم کیا جائے کسی کو نہیں بلکہ اللہ کے سبھی رسولوں اور کتابوں کا ماننا ضروری ہے۔ ایک کا انکار سب کا انکار ہے۔ ادیان کی بنیادی وحدت کو تسلیم کرنا، پیشوایانِ مذاہب کا احترام کرنا، مقدس مذہبی کتابوں کی عزت کرنا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو اہل مذاہب کے درمیان مصالحت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اس مصالحانہ دعوت کو عام کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے قیصر روم کو اسلام کا جو دعوت نامہ بھیجا تھا اس میں وضاحت کے ساتھ تحریر تھا۔

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضاً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون	اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مسلم ہے یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور اللہ کے علاوہ ہمارے بعض بعض کو رب نہ بنائیں پس اگر وہ (اس متفق علیہ بات کو بھی ماننے سے) منہ موڑیں تو تم ان سے کہدو کہ تم گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کے ساتھ امن و خیر سگالی کا ایک معاہدہ کیا، ان کی دلداری کی بہت سی باتیں کیں۔ ان کے بزرگوں کے احترام کا اعلان کیا۔ ان کے پیغمبروں اور کتاب پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ ان کے مفید اور اچھے رسوم و اعمال مسلمانوں نے اختیار کیے۔ ان کے یہاں رشتہ جائز قرار دیا۔ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال قرار دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قبلہ کو اپنا قبلہ مقرر کیا اور سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کے رُخ پر نمازیں پڑھتے رہے

یہی برتاؤ آپ کا عیسائیوں کے ساتھ بھی تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو نبی برحق تسلیم کیا، حضرت مریم کی بزرگی اور پاکیزگی کی شہادت دی اور عیسائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا تو آپؐ نے انھیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور جب ان کی عبادت کا وقت آیا تو انھیں اسی مقدس مسجد میں شریعتِ عیسوی کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دی۔

اسلام نے ان کے ساتھ جو دوستانہ رویّہ اختیار کیا تھا، اگر وہ لوگ اس کی قدر کرتے اور اس کے جواب میں خود بھی مصالحت اور دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تو اہلِ کتاب اور مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور جنگ و جدل کے بجائے محبت و یگانگت کی ایسی دلکش مثال قائم ہو جاتی جو دوسروں کے لیے باعثِ تقلید ہوتی۔ اگر تعصبات سے بالاتر تاریخی

کشاکش سے علاحدہ صدیوں کے روایتی تاثرات سے ذہن کو تھوڑی دیر کے لیے آزاد کر کے قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے اور پیغمبر علیہ السّلام کے طرزِ عمل پر غور کیا جائے تو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اگر اہلِ کتاب اس دعوتِ اتحاد پر لبیک کہتے اور تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم (آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے نزدیک یکساں ہے) کے اصول کو تسلیم کر کے مشترک عقائد و اعمال کی بنیاد پر متحد ہو جاتے تو اسلام کے وسیع دائرے میں ان کی بھی گنجایش نکل آتی اور پیغمبر اسلام کی قیادت میں اسلامی شریعت کے اندر ان کی علاحدہ اور مخصوص حیثیت تسلیم کر لی جاتی اور جس طرح جبریہ و قدریہ ظاہری و باطنی، معتزلہ و اشاعرہ، خوارج و نواصب، خوجے و بوہرے اور شیعہ و سنّی دونوں فرقے عقائد و اعمال میں اختلاف بلکہ ایک دوسرے کی تضلیل و تکفیر کے باوجود اسلامی فرقوں میں شمار ہوتے ہیں اور اسلامی برادری کے وسیع دائرے میں شامل ہیں۔ اسی طرح اہلِ کتاب بھی اسلام کی بین الاقوامی برادری میں داخل سمجھے جاتے اور ایک عظیم ترقوم صفحۂ عالم پر نمودار ہو جاتی، پھر اتحاد کے یہ حدود دوسری قوموں کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیتے اور ساری دنیا پیغمبر اسلام علیہ السلام کی سیادت اور قرآن مجید کی قیادت میں امن و سکون اور صلح و آشتی کی زندگی بسر کرتی۔ لیکن افسوس ہے کہ سیاسی و معاشی وجوہ سے عالمگیر اتحاد کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور رشک و حسد اور تعصب و گروہ بندی نے اتفاق کو بنیادِ کار بنانے کے بجائے اختلاف کو فکر و نظر کا موضوع بنایا نقطۂ نظر کی اس تبدیلی نے مفاہمت و مصالحت کے بجائے مخالفت کے دروازے کھول دیے اور جنگ و جدل کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے ساری تاریخ کو داغ دار کر دیا۔

لیکن اب بھی موقع ہے کہ عالمی اتحاد کی کوشش کی جائے۔ اسلام نے جنگ جو معاندین کے لیے بھی صلح کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ حسن اخلاق اور لطف و مدارات کے ذریعے ان کو امن کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر راغب کیا ہے۔ صلح پسندی کی انتہا یہ ہے کہ مصالحت کا اختیار تمام تر مخالفین کو دے دیا ہے، مسلمانوں کو پہل کرنے کی اجازت نہیں ہے، صرف جوابی کارروائی کا حق ہے۔ جنگ کے دوران بھی زیادتی

کی اجازت نہیں دی گئی۔

لا یجرمنکم شنآن قوم — کسی قوم کی دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرے

ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ — انصاف سے کام لو، یہی تقویٰ کے قریب ہے۔

عین میدانِ جنگ میں بھی اگر مخالفین صلح کی درخواست کریں تو مسلمانوں کے لیے اسے قبول کرنا ضروری ہے۔ وہ مصالحت کی دعوت کسی حال میں بھی رد نہیں کر سکتے پیغمبر اسلام کو خاص طور سے ہدایت کی گئی ہے کہ:

وان جنحوا للسلم فاجنح — اگر وہ صلح کے لیے مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو

لھا وتوکل علی اللہ — جاؤ اور خدا پر بھروسا رکھو۔

محض اندیشہ اور خیالی خدشہ کی بنیاد پر صلح کی درخواست رد نہیں کی جا سکتی ہے بلکہ خدا کے بھروسہ پر ان کی درخواست مصالحت قبول کر لی جائے گی۔

الغرض ہر موقع پر امن و آشتی، عفو و درگزر اور صلح و سلامتی کی کوشش اسلام نے کی ہے اور جنگ و جدل کا راستہ صرف اس وقت اختیار کیا ہے۔ جب مخالفین نے صلح کی تمام صورتیں رد کر دی ہوں اور مقابلے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا ہو۔ ایسی حالت میں اسلام اپنے پیروؤں کو جوابی کارروائی کی اجازت دیتا ہے لیکن تاکید کرتا ہے کہ ہر وقت امن و سلامتی کے لیے کوشاں اور صلح کے پیغام کے لیے گوش بر آواز رہیں

دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

اے ہمارے رب ہمیں دُنیا اور آخرت میں اچھائی عطا فرما اور آتش (دوزخ) کے عذاب سے بچا۔

مندرجہ بالا قرآنی دعا ہر وقت ہماری زبان پر رہتی ہے۔ لیکن کبھی اس طرف دھیان نہیں جاتا کہ اس دعا میں پہلے اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں خیر و خوبی طلب کرنے کی تلقین کی ہے اس کے بعد آخرت میں اچھائی اور عذاب جہنم سے حفاظت کی درخواست کا حکم دیا ہے اس دعا کے الفاظ پر پوری طرح غور نہ کرنے کی وجہ سے دنیا کی جانب ہماری توجہ دینی نقطۂ نظر سے نہیں ہوتی اور بجائے اس کے کہ ہم اسے دین کی راہ کا پہلا قدم سمجھیں اسے آخرت کی خیر و فلاح میں حارج سمجھتے ہیں۔ اللہ کی بتائی ہوئی اس ترتیب کو ذہن میں نہ رکھنے کی وجہ سے ہم دنیا میں بھی ناکام رہتے ہیں اور آخرت کی جانب بھی ہمارے قدم صحیح نہیں اُٹھتے ہیں اور دین و دنیا کی تفریق کا عقیدہ ہماری زندگی کو پراگندہ سے پراگندہ تر کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ اسلام نے بڑی صفائی کے ساتھ رہبانیت (ترک دنیا) سے انکار کیا ہے۔ قرآن مجید نے رہبانیت کو اہلِ کتاب کی اختراع قرار دیا ہے فرمایا:

ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ (سورہ حدید پارہ [۲۶])

اُنھوں نے رہبانیت از خود ایجاد کرلی۔ ہم نے تو رضائے الٰہی کے سوا ان پر یہ واجب نہیں کیا تھا۔

پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:

لا رھبانیۃ فی الاسلام   اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

لیکن اللہ و رسول کی اس وضاحت کے بعد ترکِ دنیا کا عقیدہ ہمارے دلوں سے نہیں نکلتا اور ہم یہی سمجھتے ہیں کہ دنیا کو نظر انداز کیے بغیر ہم پورے طور پر دین دار نہیں ہو سکتے نہ انعامِ خداوندی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں لیکن یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ دُنیا کو نظر انداز کرنے کا تصور بالکل غیر اسلامی ہے۔ یہ دین کی سیڑھی کا پہلا زینہ ہے اور آخرت کی راہ دنیا ہی سے ہو کر گئی ہے الدنیا مطیۃ لآخرہ (دنیا آخرت کی سواری ہے) اس پر سوار ہو کر ہم آخرت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ الدنیا مزرع الآخرہ (دنیا آخرت کا کھیت ہے) یہیں ہم نیکی کے بیج بو کر آخرت کے لیے حسنات کا خرمن جمع کر سکتے ہیں۔

انسان دنیا میں خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے اور ساری کائنات کو صحیح راہ پر چلانے پر مامور ہے۔ اس کا کام محض حمد و ثنا نہیں ہے اس کے لیے تو فرشتے موجود تھے جس وقت خدا کی طرف سے ابوالبشر حضرت آدمؑ کو خلافت کے منصب پر مامور کیا جا رہا تھا تو فرشتوں نے اپنی تسبیح و تحمید کو اس منصب کے استحقاق کے لیے پیش کیا تھا لیکن خدا نے فرمایا تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو انسان کی تخلیق کا مقصد تسبیح و تقدیس سے بلند ہے۔ اسے ساری اشیا کا علم عطا کیا گیا ہے اور نظامِ عالم اس کے ہاتھ میں دیا جا رہا ہے۔ اب اس کائنات میں میری نیابت کرے گا اور اسے سارے جہان کو صحیح راہ پر چلانے پر مامور کیا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کو اس بارے میں ساری دُنیا کے لیے نمونہ بنایا گیا تھا، فرمایا:

جعلناکم امۃ وسطا لتکونو   تم کو (افراط و تفریط سے بچا کر) امت وسط
شھداء علی الناس ویکون   بنایا تاکہ تم لوگوں کے لیے نمونۂ عمل ہو اور رسولؐ
الرسول علیکم شھیدا   تمھارے لیے ہوں۔

اُنھیں خیر الامم کا لقب دیا گیا اور نیکیوں کے پھیلانے اور برائیوں سے روکنے کی خدمت سپرد کی گئی۔

کنتم خیر امۃ اُخرِجت   تم بہترین اُمت ہو جو انسانوں (کی ہدایت)

للناس تأمرون بالمعروف — کے لیے بھیجی گئی ہے۔ تم اچھی باتوں کا حکم دو اور
وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ — بری باتوں سے روکو اور اللہ پر یقین رکھو۔

ان کو گوشے میں بیٹھ کر نامِ حق لینے کے بجائے بحر و بر میں سطوتِ حق قائم کرنے کا حکم تھا اور خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کے بجائے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کی تاکید تھی لیکن اب ہمارا حال یہ ہے کہ زندگی کی کش مکش سے خوف زدہ اور کشاکشِ حیات سے گریزاں کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ بجائے اس کے کہ رہوارِ عالم کی باگ ہاتھ میں لے کر اسے صحیح راہ پر چلائیں۔ اس سے اُتر کر ایک کونے میں کھڑے اس کی بے راہ روی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ کبھی اس کی کج روی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کبھی آہ و فغاں مگر یہ ہمت نہیں ہوتی کہ آگے بڑھ کر اس کی باگ پکڑ لیں اور اسے راست روی پر مجبور کر دیں۔

کیسے تعجب کی بات ہے کہ جن کے دین کا مقصد احتسابِ کائنات تھا وہ گوشہ گیری اور عزلت نشینی کو ایمان کا تقاضا اور دین کا مقصود سمجھ رہے ہیں اور سرافرازی کے بجائے سر بزیری پر مطمئن و مسرور ہیں۔ قرآن مجید کے اوراق کھلے ہیں دیکھو کسی ورق میں میدانِ حیات سے گریز کی تعلیم نظر آتی ہے۔ آپ ایک ایک سطر پڑھ ڈالیے۔ کہیں سرافگندگی کا مشورہ نہ ملے گا بلکہ جادۂ حق پر جمے رہنے اور باطل سے نبرد آزمائی کی تلقین نظر آئے گی اور اگر زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز کا حکم ملے گا احکام و ہدایات میں یہی رُوح کارفرما ہوگی اور قصص و امثال میں اسی حقیقت کو ذہن نشین کیا ہوگا۔ حضرت نوحؑ کے واقعات ہوں خواہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کا تذکرہ ہو یا حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی سرگزشت سب کا مقصد راہِ حق میں سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کی دعوت کے سوا اور کچھ نہیں۔ قرآن پاک نے اسی لیے ان انبیا کو اولوالعزم (صاحبانِ عزم) کہا ہے کہ وہ مشکلات سے گھبرا کر گوشہ نشین نہیں ہوئے بلکہ عالم کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے کی جد و جہد میں لگے رہے اور بلاخیز موجوں سے گھبرا کر ساحل پر پناہ لینے کے بجائے وہ انسانیت کے ڈوبتے ہوئے سفینے کو گرداب سے نکالنے کی کوشش کرتے

رہے۔ وہ طوفان میں بہنے کے بجائے چٹان کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔
پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات زندگی بھی سامنے ہیں کہیں کار زار حیات سے گریز کا کوئی واقعہ نظر آتا ہے یا ترکِ دنیا کی کوئی تعلیم ملتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں آپ کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ کہیں دنیا کو بدی میں مبتلا چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہنے کا اشارہ ملتا ہے یا باطل کے آگے سرنگوں ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس قدم قدم پر زندگی کے میدان میں جد و جہد کے واقعات نظر آتے ہیں اور اس عالم کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کے لیے جسم و جان کی بازی لگا دینے کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کو رہبانیت اور ترکِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا مکّی زندگی ہو یا مدنی، کسی دور میں بھی آپ نے گوشہ نشینی کو ترجیح نہیں دی۔ نہ صرف تنہائی میں بیٹھ کر یادِ خدا پر قناعت کی بلکہ انتہائی مشکل اور ناموافق حالات میں بھی رزم گاہِ حیات سے منہ نہیں موڑا اور زمانے کے دھارے کو باطل کی طرف سے پھیر کر حق کی جانب لانے کی کوشش کرتے رہے۔

آپ کے سرِ رسالت کی بڑی اہم ذمہ داری تھی۔ آپ سارے جہانوں کے لیے پیغامِ رحمت بن کر آئے تھے اور کالے گورے سبھی کو راہ ہدایت دکھانا آپ کا کام تھا۔ باطل کی قوتیں قدم قدم پر سدِّ راہ تھیں۔ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی ستیزہ کار تھے۔ اور نورِ ہدایت کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے۔ فرائض رسالت کی گرانباری کا یہ عالم تھا کہ آپ کے شانے کانپ رہے تھے۔ اور پیٹھ چور چور ہوئی جا رہی تھی لیکن اتنی بڑی ذمہ داری کی ادائیگی کے وقت بھی آپ دُنیاوی علائق سے بے تعلق نہیں تھے۔ بیویاں تھیں، بچے تھے، اعزہ و احباب تھے، فکرِ معاش تھی، مشاغلِ حیات تھے لیکن آپ نے ان سارے روابط کو حسن و خوبی کے ساتھ قائم رکھا اور ان کے ساتھ رسالت کے فرائض بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیے اور بندگی کا حق بھی اچھی طرح ادا کیا۔ نہ عبادت کا شوق فرائض رسالت میں حارج ہوا، نہ اہل و عیال کی دیکھ بھال میں کوئی کمی ہوئی۔ نہ سماج کی فلاح و بہبود

کی فکر سے کبھی غافل ہوئے۔ آپ کے نزدیک دنیا کو چھوڑ کر عبادت و ریاضت کوئی کمال کی بات نہیں تھی۔ کمال کی بات یہ تھی کہ دنیاوی مشاغل کے ساتھ دینی فرائض انجام دیے جائیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ مخلوق خدا کا کنبہ ہے اچھا وہی ہے جو اس کے کنبہ یعنی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔ فرماتے تھے کہ تم پر تمھارے نفس کا بھی حق ہے تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے۔ تم میں سے بہتر وہی ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر، پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، غریبوں کی خدمت یتیموں کی دلدہی اور محتاجوں کی حاجت روائی آپ کا محبوب مشغلہ تھا اور دوسروں کو اس کی تاکید فرماتے تھے۔ پھر ان کاموں کے علاوہ صلح و جنگ کے مسائل اور تجارت و کاروبار کے معاملات بھی آپ طے کرتے تھے۔ آپؐ کی مصروفیت دوسرے لوگوں سے [illegible]

[illegible]

تو مسافروں کے لیے نماز میں قصر کی اور روزہ کے افطار کی اجازت دی۔ پانی میسر نہ ہو تو وضو اور غسل کے بجائے تیمم کا حکم دیا۔ بیماری کی حالت میں بہت رعایتیں دیں۔

بھوک لگی ہو اور نماز کی جماعت شروع ہو گئی ہو تو حکم دیا کہ نماز میں شریک ہونے کے بجائے
پہلے کھانا کھالو۔

قرآن مجید اور احادیث میں اس طرح کی سہولتوں کی بہت سی صورتیں بیان
کی گئی ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر چند باتوں کا ذکر کر دیا گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ الدین
یُسر (دین آسان ہے) جو لوگ نماز روزہ وغیرہ عبادات میں حد سے زیادہ انہماک
سے کام لیتے تھے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ اتنا ہی کرو جتنی طاقت ہو۔ بعض صحابہ نے
راہبانہ زندگی اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو ان کو منع کیا اور فرمایا میں تم سے زیادہ خدا

ساتھ ایسا اچھا برتاؤ کرنے پر منحصر قرار دی گئی ہے کہ وہ اس کا اعتراف کریں اور اس کی نیکی کی شہادت دیں۔ مشہور حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے صحابہ کرام بھی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ اتنے میں ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کے اعمالِ حسنہ کی تعریف کی، آپ نے فرمایا وَجَبَتْ (واجب ہو گئی) تھوڑی دیر میں ایک اور جنازہ گزرا۔ اب کی لوگوں نے اس کی برائی کی آپ نے فرمایا (وَجَبَتْ (واجب ہو گئی) صحابہ نے عرض کیا کیا چیز واجب ہو گئی فرمایا پہلے کے لیے جس کی تم نے تعریف کی جنت واجب ہو گئی اور دوسرے کے لیے جس کی تم نے برائی کی دوزخ واجب ہو گئی پھر فرمایا:

انتم شهداء الله في الارض — تم زمین پر خدا کے گواہ ہو۔

اسی حقیقت کو اکبر الٰہ آبادی نے اپنے خاص انداز میں اس طرح کہا ہے۔

اکبر کی برائی اور بھلائی پوچھ اس کے محلہ والوں سے
دیوان تو ہم نے دیکھا ہے، شعر تو اچھے کہتا ہے

اسی کو کسی نے یوں بھی کہا ہے۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آل واصحاب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی رہبانیت اور ترکِ دنیا کو اسلامی تعلیم کے منافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے عزلت نشینی اور گوشہ گیری کی طرف کبھی توجہ نہیں کی بلکہ کاروبارِ حیات میں مشغولیت کے ساتھ راہِ نجات کی فکر کی۔ وہ اہل وعیال کے ساتھ رہ کر، تجارت و زراعت کے دھندوں میں لگ کر، دوستوں اور عزیزوں کی صحبت میں رہ کر اور دین وملت کی خدمت کرکے ثواب آخرت کماتے تھے۔ فضا کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو، حالات کیسے ہی ہمت شکن ہوں، آفات ومصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو، لیکن انھوں نے گوشۂ عافیت کو ترجیح نہیں دی، نہ مصافِ زندگی سے گریز کی راہ اختیار کی، نہ باطل کے سامنے سرنگوں ہونا پسند کیا بلکہ موجوں کے تلاطم میں بھی سفینۂ ملت کی ناخدائی کرتے رہے

اور اس راہ میں مال ومتاع کیا چیز ہے، جان کی قربانی کی ضرورت ہوئی تب بھی اُن کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی اور خوشی خوشی جان جان آفریں کو پیش کر دی۔ انھوں نے گوشۂ عافیت کے سکون پر قید وبند اور دار ورسن کی آزمایش کو ہمیشہ ترجیح دی۔

قرن اول کے مسلمانوں کی یہی خصوصیت تھی جس نے اُنھیں دینی عزت وعظمت کے ساتھ دنیاوی شان وشکوہ بھی عطا کیا تھا اور گنتی کے چند برسوں میں وہ بحر وبر کے مالک بن گئے تھے اور چار دانگِ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس عہد میں لوگ دین ودنیا کی تفریق سے نا آشنا تھے ان کے نزدیک زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی نہیں تھی۔ وہ دینی سیادت اور دنیاوی ریاست کے درمیان کوئی تضاد نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں کی جامعیت کے قائل تھے اور اس شعر کو شعر نہیں بلکہ حقیقت سمجھتے تھے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

اللہ کے لیے کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ سارا عالم ایک ذات کے اندر جمع کر دے۔

اس زمانے میں دینی رہنما دنیاوی معاملات کو اور دنیاوی سربراہ دینی مسائل کو بخوبی سمجھتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو مسندِ درس وافتا سے اُٹھ کر حکومت کی باگ ہاتھ میں لیتے اور تختِ سلطنت پر بیٹھ کر کتاب وسنت کی شرح وتفسیر بیان کرتے

خلفائے راشدین کے بارے میں تو کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ ان کی ذات میں حکومت وخلافت اور امامت وسیادت جمع تھی۔ وہ بیک وقت دنیاوی حکمراں بھی تھے اور دینی رہنما بھی۔ وہ حکومت وسلطنت کے معاملات بھی طے کرتے تھے اور کتاب وسنت کے مسائل بھی بیان کرتے تھے، وہ بیک وقت حکومت کے سربراہ، فوج کے سردار، مسجد کے امام اور شریعت کے

ترجمان تھے۔ ان کے مشیروں، صوبیداروں، سپہ سالاروں اور انتظامی افسروں کا بھی یہی حال تھا۔ ابھی امور سلطنت کے بارے میں ہدایات دے رہے ہیں۔ ذرا دیر میں منبر پر خطابت کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ پھر دیکھو محراب مسجد میں کھڑے نماز کی امامت کر رہے ہیں۔ وہاں سے ہٹے تو حلقہ درس میں بیٹھ گئے اور قرآن و حدیث کے اسرار و رموز کی پردہ کشائی اور احکام شریعت کی تشریح و تفصیل کرنے لگے اور حالات کا تقاضا ہوا تو میدانِ جنگ میں جا پہنچے اور فوجوں کی کمان ہاتھ میں لے لی اور جب صلح کی گفتگو شروع ہوئی تو ایک دوربین اور معاملہ فہم مدبّر کی طرح شرائط صلح طے کیں اور صلح نامہ پر دستخط کر دیے۔

دین و دنیا کی یہ جامعیت کچھ خلافت راشدہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ اس کے بعد بھی مدتوں یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اگرچہ مذہبی روح میں فرق آگیا تھا۔ مگر غالب وہی تھا اس لیے دین سے واقفیت اور دنیاوی زندگی پر اس کے انطباق کی ضرورت اب بھی تھی سلطنت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ دنیا کی مختلف قومیں اسلامی حکومت کے دائرے میں آباد تھیں۔ کچھ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور کچھ نے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنا منظور کر لیا تھا۔ ان مختلف نسلوں تہذیبوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کو اسلامی حکومت کی وحدت میں سمونا خاصا مشکل کام تھا لیکن حکمران اور ان کے مشیر کتاب اللہ کی وسعت اور سنّت نبوی کی جامعیت سے واقف تھے اور ان کے اندر اس کی صلاحیت تھی کہ اس بحرِ بیکراں میں غوطہ لگا کر شریعت کے ایسے آبدار موتی برآمد کر لیں جن کو آویزۂ گوش بنانے میں کسی کو تامل نہ ہو۔

ذرا ان فرمانرواؤں کو دیکھو عبدالملک ابھی فقہاء صحابہ کے حلقے میں قرآن، حدیث اور فقہ و فتاویٰ کا درس لے رہا ہے اور ان علوم میں اس درجۂ کمال تک پہنچ گیا ہے کہ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ آئندہ مسایلِ دینی میں اسی کی ذات مرجع خلایق ہو گی۔ لیکن جب حالات بدلتے ہیں اور وہی عبدالملک میدانِ جنگ میں

قدم رکھتا ہے تو ایک کامیاب سپہ سالار ثابت ہوتا ہے اور جب تخت سلطنت پر پہنچتا ہے تو تدبّر و سیاست اور جہاں بینی و معاملہ فہمی کا امام سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ الخلیس تو سبھی دین و سیاست، زہد و تقویٰ اور علم و کمال کا سنگم سمجھتے ہیں۔ ہارون و مامون کو دیکھیے وہ جس طرح حکومت و سیاست اور جہاں بانی و جہاں آرائی میں کمال رکھتے تھے اس طرح مسند علم و فضل کے صدر نشین بھی تھے۔ منصور صاحب سیف و نگین اور مدبّر و منتظم سمجھا جاتا ہے لیکن وقت پڑتا ہے تو قلم بھی ہاتھ میں لے لیتا ہے اور جن مسائل میں صاحبانِ علم گنگ نظر آتے ہیں وہ ان کی عقدہ کشائی اس خوش اسلوبی سے کر دیتا ہے کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ منصور بن ابی عامر جامعۂ قرطبہ میں درس لے رہا ہے۔ لیکن انتظامی مملکت پر بھی غور کر رہا ہے۔ کتاب کھلی ہے اور وہ محکمۂ قضا کی الجھنیں سلجھا رہا ہے۔ آخر وہ وقت آیا کہ وہ وزارت کے منصب پر پہنچا اور شمشیر و قلم دونوں کے وہ جوہر دکھائے کہ آج تک لوگ حیرت زدہ ہیں۔

اچھا ذرا حکمرانوں کی محفل سے اٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے علما و صلحا کی مجلس میں آجائیے، ابن شہاب زہری اپنے زمانے میں قرآن و حدیث کے امام تھے۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنا باعثِ شرف سمجھتے تھے لیکن وہی زہری امورِ حکمرانی اور آئینِ جہاں بانی میں ایسی فہم و فراست اور عقل و بصیرت رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے حکمراں ان سے مشورے کے طالب ہوتے تھے اور ان کا وجود دربار کی زینت سمجھا جاتا تھا۔ عامر شعبی کی علمی جلالت شان کا ایک عالم معترف ہے، فقہ و حدیث کے بے نظیر امام تھے۔ سارا ملک فتاویٰ میں ان کا محتاج تھا لیکن ضرورت پڑتی ہے تو یہی شعبی مسندِ درس سے اٹھ کر میدانِ جنگ میں آکھڑے ہوتے ہیں اور آزمودہ کار سپہ سالار سمجھے جاتے ہیں۔ پھر موقع آتا ہے تو یہی شعبی امورِ سلطنت میں تجربہ کار مشیر ثابت ہوتے ہیں۔ اموی فرمانروا عبدالملک کو ایک بار قیصر روم سے بعض اہم معاملات طے کرنے کے لیے ایک لائق سفیر کی

ضرورت محسوس ہوئی - غور کیا تو امام شعبی سے بڑھ کر اس کام کے لیے کوئی شخص موزوں نظر نہ آیا - جب وہ رومی دربار میں پہنچے تو سفارت کے فرائض اس خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیے اور معاملات کو اس قابلیت کے ساتھ پیش کیا کہ قیصر دنگ رہ گیا اور عبدالملک کو غیر معمولی تعریفی خطوط لکھے -

رجاء بن حیات اموی عہد کے نامور محدث ہیں - علمی کمالات کے ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی بے نظیر سمجھے جاتے تھے لیکن اس علم و فضل اور ورع و تقوی کے ساتھ سیاسی سوجھ بوجھ کا یہ حال تھا کہ سلاطین پیچیدہ معاملات میں ان سے مشورہ کرتے تھے اور ان کا ناخن تدبر عقدہ ہائے لاینحل کی اس خوبی کے ساتھ گرہ کشائی کرتا تھا کہ زبانوں سے بے اختیار صدائے احسنت و مرحبا بلند ہو جاتی تھی - انھیں کی قابلیت کا یہ نتیجہ تھا کہ بنی امیہ کے تخت خلافت پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رضہ بیٹھ سکے - ان کے صائب مشورے کی تفصیل تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے -

لوگ سلیمان وہارون کے سامنے ابوحازم کے وعظ اور سماک کی نصیحت کے واقعات پڑھتے ہیں - جب سلطان کی رقت و اشکباری کا منظر سامنے آتا ہے تو اسے ایک واعظ کے موثر وعظ اور ایک ناصح کی پرخلوص نصیحت کا اثر سمجھتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ان مطلق العنان بادشاہوں کو متاثر کرنا محض واعظ و ناصح کے بس میں نہ تھا - اگر وہ ان حکمرانوں کی نفسیات پر گہری نظر نہ رکھتے ہوتے تو یہ تاثیر ناممکن تھی - وہاں تو بات پر زبان کٹتی اور مشورے پر سر قلم ہوتے تھے -

ہارون رشید کے عہد میں قاضی ابویوسف اور مامون کے دور میں قاضی یحییٰ بن اکثم کے اثر و رسوخ کے واقعات تاریخ کے اوراق میں درج ہیں لیکن اتنی بڑی وسیع سلطنت میں قانون و عدالت کا سربراہ ہونا محض کسی فقیہ کے امکان میں نہ تھا - اگر ان بزرگوں کا علم و تجربہ غیر معمولی وسیع نہ ہوتا اور وہ گرد و پیش کے حالات سے واقف، سلاطین کی نفسیات سے آگاہ اور دربار کی نزاکتوں سے پورے طور پر باخبر نہ ہوتے - ساتھ ہی سلطنت کی ضرورتوں اور زمانے کے تقاضوں کا صحیح اندازہ نہ ہوتا - وہ

کتاب وسنت کو خوب سمجھتے تھے۔ ارشاداتِ ربّانی اور فرامینِ مصطفوی پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کے اندر اجتہاد کی صلاحیت تھی اور انھیں اصول سے فروع کے استنباط کا بڑا ملکہ تھا اور وہ اسلام کے ابدی اصول کو تغیر پذیر حالات میں منطبق کرنے کا بہترین سلیقہ رکھتے تھے اور انھیں آئینِ شریعت کے نفاذ کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ ان کے اندر روحِ ایمان بھی تھی اور جرأتِ کردار بھی۔ اِن کی جلالتِ شان کا اندازہ کچھ آپ اس واقعہ سے کر سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید حج کے ارادے سے روانہ ہوا، امراء وزرا، خدام وحشم اور فوج وسپاہ کا جمِ غفیر ساتھ تھا۔ قاضی القضاۃ امام ابو یوسف بھی ہمراہ تھے ایک دن خلیفہ نے عنایت خاص کے اظہار کے لیے قاضی صاحب کو اپنی خاص سواری پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ دورانِ گفتگو میں خلیفہ نے قاضی صاحب کو ممنون احسان کرنے کی غرض سے کہا۔ قاضی صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس کے ساتھ بیٹھے ہیں کہا۔ ہاں، لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ کس کے پاس بیٹھے ہیں۔ عباسی فرمانروا تو بہت ہوں گے لیکن ابو یوسف کہاں، تاریخ اس شرف کو کبھی بھلا نہ سکے گی؟"

اپنے ملک کی تاریخ بھی اس قسم کے واقعات سے خالی نہیں ہے۔ یہاں بھی التمش حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے قدم پکڑے ہوئے رہنمائی کا طالب نظر آتا ہے۔ علاء الدّین خلجی حضرت نظام الدین رح سے امورِ مملکت میں مشورہ مانگتا ہے۔ محمد بن تغلق مسائل شریعت پر علماء ومشایخ سے بحث کرتا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح سلاطین کو مشورے دیتے ہیں اور مشکلات کو حل کرتے ہیں دارا تصوف اور اسرار شریعت پر کتابیں لکھتا ہے، اورنگ زیب تصوف وسلوک کی تربیت حاصل کرتا ہے اور قرآن وحدیث اور فقہ واصول کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی علمِ دین اور اسرار شریعت کے امام اور مجدّدِ عصر ہیں۔ لیکن دنیاوی معاملات میں بھی ایسے دور بین اور صاحبِ نظر ہیں کہ مغل سلطنت کا رُخ بدل دیتے ہیں۔ شاہجہاں کے وزیر اعظم سعد اللّٰہ خاں بیدار مغز، مدبّر اور

لایق وزیر سلطنت کے ساتھ علوم دینیہ اور عقلیہ میں بھی کمال رکھتے ہیں بعض کتابوں پر ان کے حواشی آج بھی ان کی قابلیت اور ژرف نگاہی کے گواہ ہیں۔ ملّا عبدالقادر کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے کوئی اختلاف کرے مگر ان کی علمی صلاحیت وادبی کمال، دینی واقفیت اولیاء وصلحاء سے ارادت، سیاسی تجربہ اور فوجی مہارت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان رزم و بزم اور مسجد و خانقاہ کے واقعات اوراقِ تاریخ میں ثبت ہیں۔ فیضی کی ادبی اور شاعرانہ عظمت مسلّم ہے۔ اس کے ساتھ سیاسی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔ بادشاہ کا مزاج داں اور دربار کی نزاکتوں سے باخبر ہے اسی کے ساتھ علومِ دینیہ میں بھی کمال رکھتا ہے خواہ اس کی ذات سے کسی کو اختلاف ہو، اس کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو یا اس کے طرزِ عمل کو ناپسند کرتا ہو مگر اس کے باوجود علوم اسلامیہ میں اس کی قابلیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اس کی بے نقط تفسیر اس کی مہارتِ فن پر دال ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی دینی اور دنیاوی علوم پر گہری نظر عالم آشکارا ہے۔ حدیث و تفسیر، فقہ واصول تاریخ وسوانح، ادب وشعر، تصوف واسرارِ شریعت کی تمام راہوں سے باخبر ہیں اس قابلیت کے ساتھ وہ مرشدِ کامل، صوفی باصفا، شیخ طریقت، صاحب کشف وکرامات ولی اور روشن ضمیر بزرگ ہیں۔ پھر وہ زمانے کے حالات، سیاسی ومعاشی تغیرات اور وقت کے تقاضوں سے باخبر اور اجتہاد کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف دینی ودنیاوی علوم میں ان کی جامعیت، ان کے تجربے کی وسعت حالات زمانہ سے گہری واقفیت اور اصلاح حال کی صلاحیت کی گواہ ہیں۔ ان کے متوسلین میں سید احمد شہید مولانا عبدالحی بڈھانوی اور شاہ اسمٰعیل کے حالات وکمالات سب کو معلوم ہیں۔ دین ودنیا کی جامعیت ریاست وسیادت کی معیت اور سیف وقلم کی یکجائی کی ایسی اعلیٰ مثالیں، دورِ آخر میں بہت کم نظر آتی ہیں

سطورِ بالا میں تاریخ کے سارے واقعات کا استقصاء نہیں کیا گیا ہے اس مختصر مضمون میں یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف اسلام کے اس نقطۂ نظر کو پیش کرنا مقصود ہے کہ دین دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کا صحیح

استعمال ہی دین ہے اور یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ دین و دنیا کی تفریق نہ دین کے لیے مفید ہے نہ دنیا کے لیے۔ آج اس تفریق نے ملّت پر ترقی و سربلندی کی راہیں بند کر دی ہیں اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دینی امامت اور دنیا وی قیادت ایک ہی ذات میں جمع ہوں بقول مولانا شبلیؔ:

اے کہ پرسی کہ دریں کار چہ تدبیر شود
دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود

○

عبادت کا مفہوم و مقصود

مزاجِ خانقاہی کے عنوان سے ایک فکر انگیز اداریہ جنوری
۱۹۷۳ء کے "اسلام اور عصرِ جدید" میں شائع ہوا تھا یہ
تاثرات اُسی کا نتیجہ ہیں۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان صرف عبادت کے لیے پیدا کیا گیا
ہے اور ثبوت میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

وما خلقتُ الجنَّ والاِنس | میں نے جنّ و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے
اِلّا لِیعبدُون | کہ وہ میری عبادت کریں۔

اول تو سیاق و سباق کے اعتبار سے اس آیت کا مقصد ان لوگوں کے
غلط عقیدے کی تردید ہے جو خدا کا یہ تصوّر رکھتے تھے کہ دُنیاوی بادشاہوں
کی طرح خدا بھی بندوں کی اعانت کا خواستگار ہے۔ اس آیت میں اس خیال
کی تردید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جنّ و انس کو صرف اللہ کی بندگی کرنی چاہیے
اس کے سوا ان سے کسی اور چیز کا مطالبہ نہیں ہے۔

مآ اریدُ منھم من رزقٍ ومآ | میں ان سے نہ رزق چاہتا ہوں نہ یہ چاہتا
اُریدُ اَن یُطعِمُون ۔ اِن اللہ | ہوں کہ مجھے کھلائیں اللہ خود رزق دینے والا
ھُو الرزاق ذو القوۃِ المتین | اور مستحکم قوت والا ہے۔

علاوہ ازیں عبادت کا مفہوم بھی صحیح نہیں سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ
یہ سمجھتے ہیں کہ اوراد و وظائف، تسبیح و تہلیل اور نماز روزے ہی کا نام عبادت ہے

حالانکہ عبادت کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ عربی میں عبد غلام کو کہتے ہیں جس طرح غلام کا فرض ہے کہ بے چون وچرا مالک کی فرمانبرداری کرے اُسی طرح انسان کا فرض ہے کہ اپنے حقیقی مالک یعنی اللہ کی فرمانبرداری کرے انسان محض تسبیح وتقدیس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے، اس کے لیے تو فرشتے پہلے سے موجود تھے۔ لیکن حمد وثنا کے زمزموں اور تسبیح وتقدیس کے ترانوں کے باوجود خدا نے اعلان کیا کہ:

اِنّی جاعِلٌ فی الارض خلیفہ	میں زمین میں خلیفہ (اپنا نائب) بنانے والا ہوں

انسان کائنات میں خدا کی نیابت پر مامور کیا گیا ہے۔ اس کا مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ خدا کی مرضی کے مطابق سارے عالم کا انتظام کرے۔ یہی وہ بارِ امانت تھا جس کے اُٹھانے سے آسمان وزمین کانپ اُٹھے تھے۔

اِنّا عرضنا الامانۃَ علی السمٰوٰت	ہم نے امانت (نیابت کی ذمہ داری) آسمانوں
والارضِ و الجبال فابَینَ اَن	پہاڑوں اور زمین پر پیش کی لیکن اُنھوں نے
یَحمِلنَھا واَشفقنَ منھا	اس کے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے
وَحَمَلھَا الانسانُ انہ کان ظلوماً جھولا	ڈر گئے پر ظلوم وجہول انسان نے اسے اُٹھا لیا۔

جہل نادانی کو کہتے ہیں اور ظلم حدود سے تجاوز کا نام ہے کہنے کا منشا یہ ہے کہ نیابتِ الٰہی کی ذمہ داری بہت اہم تھی۔ کائنات کو مرضی الٰہی کے مطابق چلانا آسان نہیں انسان اپنی صلاحیت کو سمجھتا اور اپنی لبساط کو پیشِ نظر رکھتا تو آسمان و زمین کی طرح وہ بھی اس ذمہ داری سے گریز کرتا لیکن اس نے مالک کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کی امداد و دست گیری کے بھروسے پر اس بار کو اُٹھا لیا اللہ نے اس کی اس عبدیت کو پسند کیا۔ اور ساری کائنات کو اس کے زیرِ نگیں کر دیا اور کہہ دیا کہ اگرچہ

خُلِقَ الانسانُ ضعیفاً	انسان کمزور بنایا گیا ہے۔

اس کے اندر پختگی کی کمی ہے وہ نفس وشیطان کے جال میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن

اگر وہ خودسری کے بجائے مالک کی رضاجوئی کی فکر کرے گا، تو ہر قسم کے ضعف و بے چارگی کے باوجود کائنات کی ساری قوتیں اس کے لیے مسخر کردی جائیں گی۔ وہ عزت و تکریم کا مستحق قرار دیا جاچکا ہے۔

لقد کرّمنا بنی آدم۔ ہم نے اولادِ آدم کو عزت عطا فرمائی ہے۔

تفصیل بالا سے واضح ہے کہ انسان کا مقصدِ حیات اور فریضۂ منصبی کیا ہے۔ وہ اللہ کا خلیفہ (نائب) ہے اور اس کی منشا کے مطابق دنیا کو چلانا اس کا کام ہے۔ اس عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے اس کی تربیت ضروری تھی تاکہ وہ نفس کی خواہشات اور شیطان کے فریب سے محفوظ رہے اور جادۂ اعتدال سے اس کے قدم ہٹنے نہ پائیں۔ اس غرض سے نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کی تاکید کی گئی اور تسبیح و تہلیل کے آداب سکھائے گئے تاکہ بندگی کا احساس ہمہ وقت تازہ رہے۔ خدا کی عظمت و جلال کا تصور کبھی دل سے محو نہ ہونے پائے۔ اللہ کی رضاجوئی ہر وقت پیشِ نظر رہے اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین دل کی پاکیزگی، نیت کے خلوص اور عمل بے لوثی کا ضامن ہو اور آخرت کا اعتقاد نفس کو احتساب پر برابر ابھارتا رہے۔ روزِ جزا کے تصور نے کیسے کیسے مطلق العنانوں کو لرزہ براندام کر دیا ہے۔ تاریخ نے بہت سے واقعات محفوظ کر دیے ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی کس عظمت و جلال کا مالک تھا لیکن دیکھیے عقیدۂ آخرت نے اس کا کیا حال کر دیا۔ ایک دن شاہی سواری ایک پُل پر سے گزر رہی تھی۔ ایک بڑھیا کنارے پر کھڑی تھی۔ بادشاہ پاس پہنچا تو بڑھیا نے پکار کر کہا۔ "اے بادشاہ بتا تیرا انصاف اس پل پر ہوگا یا اُس پُل (صراط) پر" ملک شاہ گھبرا کر سواری سے اُتر پڑا اور کہنے لگا۔ میّا اُس پل پر کس کی ہمت ہے کہ کھڑا ہو سکے۔ بہتر یہ ہے کہ اِسی پُل پر میرا تمھارا حساب ہو جائے بڑھیا نے بتایا کہ سپاہیوں نے اس کی گائے پکڑ کر ذبح کر دی ہے۔ ملک شاہ نے معاملے کی تحقیق

کرکے مجرموں کو سزا دی۔ بڑی بی سے معافی مانگی اور گائے کی قیمت سے بہت زیادہ معاوضہ دے کر اسے راضی کیا۔

عبادت کے مقررہ نظام سے ایسی ہی ایمانی قوت پیدا کرنا مقصود ہے جس سے برائیوں سے بچنے اور اعمالِ صالحہ کے اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا رہا۔ قرآن مجید اور احادیث پاک میں جا بجا اس کی تصریح کی گئی ہے تاکہ کبھی مقصد نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ مثلاً نماز کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

انّ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر — نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا کہ اگر تمھارے قریب دریا ہو جس میں تم دن میں پانچ مرتبہ غسل کرو تو کیا تمہارے بدن پر میل باقی رہ جائے گا۔ اُنھوں نے عرض کیا، نہیں۔ فرمایا یہی حال نماز کا ہے۔ اس کے ادا کرنے کے بعد برائیوں کی آلائش باقی نہیں رہ جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ نماز اگر ٹھیک سے پڑھی جائے گی تو اس کا یہ اثر ہوگا۔ لیکن اگر یہ اثر ظاہر نہ ہو اور نماز پڑھنے کے باوجود آدمی گناہوں اور برائیوں میں مبتلا رہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ نماز ٹھیک طور پر ادا نہیں کی جا رہی ہے۔ بعض روایات میں مثالیں دے کر اس حقیقت کو ذہن نشین کیا گیا ہے۔ روزے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر آدمی کھانا پینا چھوڑتا ہے لیکن غیبت کرتا ہے، لوگوں سے جھگڑتا ہے، دل آزاری کی باتیں کرتا ہے تو خدا کو ایسے آدمی کے فاقے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید نے کہا کہ روزہ تم پر اس لیے فرض کیا گیا ہے تاکہ تمھارے اندر پرہیزگاری پیدا ہو لعلکم تتقون

——— زکوٰۃ کے لفظ کے اندر پاکیزگی کا مفہوم داخل ہے۔ زکوٰۃ ادا کرکے آدمی کمائی کو پاک کرتا ہے۔ اپنے اخلاق وعادات کو پاکیزہ بناتا ہے اور اہلِ حاجت کی حاجت روائی کرکے اپنی انسانیت کو تب وتاب بخشتا ہے۔ حج میں ایمان ویقین، ایثار و قربانی خدمت وحسن وسلوک، غم خواری وغم گساری، صبر وضبط اور اعانت ودست گیری کی قدم قدم پر مشق ہوتی ہے۔ حج کی نیت کرتے ہی آدمی کو برائیوں سے کنارہ کش

ہوجانا چاہیے اور جامۂ احرام پہنتے ہی گناہوں کا لبادہ اُتار کر پھینک دینا چاہیے۔

الحج اشھر معلومات فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج

حج کے مہینے معلوم ہیں جس نے حج کو ان مہینوں میں اپنے اوپر لازم کیا اسے بیہودہ باتوں، گناہ کے کاموں اور لڑائی جھگڑے سے حج میں پرہیز کرنا چاہیے۔

حج وہی مقبول ہوگا جو برائیوں سے پاک رہے۔ صدقہ وہی قبول کیا جائے گا جو اہانت و دل آزاری سے پاک ہو۔ روزہ وہی پسندیدہ ہے جو گناہوں سے محفوظ ہو اور نماز وہی قابلِ قدر ہے جو انسان کو آلائشوں سے پاک کر دے اور اسے اس لائق بنا دے کہ وہ خدا کی نیابت کے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکے لیکن افسوس ہے کہ عبادت کی اس روح کو مسلمانوں نے اچھی طرح یاد نہیں رکھا۔ وہ صرف مقررہ رسوم ادا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ اُس نے تمکین فی الارض کا جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا نہیں کر رہا ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وعدے کے ساتھ ایمان کامل اور عمل صالح کی شرط لگی ہوئی تھی۔

ان الارض یرثھا عبادی الصلحون — میرے صالح بندے زمین کے وارث ہوں گے

یہاں صالح کا ترجمہ نیک کر کے کچھ لوگ آیت کا مفہوم اپنے حسبِ حال کر لیتے ہیں اور خدا سے شکایت کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس لفظ کا سیدھا سادہ ترجمہ صلاحیت والے ہیں۔ آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو آپ کو یہ حقیقت نمایاں نظر آئے گی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ، حضرت صہیبؓ، وغیرہ اپنی نیکی اور زہد و تقویٰ میں بہت ممتاز تھے۔ مگر کسی غزوے کی سرداری، کسی علاقے کی امارت، کسی سفارتی مشن کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی؟ بس ان کی صلاحیت کے مطابق ان سے کام لیے گئے۔ اسلام کے اجتماعی نظام میں سب کی گنجایش تھی اور سب کے لیے عمل کی مناسب صورتیں موجود تھیں۔ لیکن نیابت کا منصب اُنھیں کو ملا جن کے اندر اس کی پوری صلاحیت تھی۔

یہ بحث طویل ہے اس جگہ ضمناً ذکر آگیا ہے۔ کبھی موقع ملا تو اس پہلو پر تفصیل سے لکھوں گا۔ سردست تو یہ عرض کرنا ہے کہ رسمی عبادات مقصود نہیں ہیں بلکہ مقصود کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں غلو کی ممانعت کی گئی ہے اور دنیادی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرکے رسمی عبادات میں انہماک کو رہبانیت قرار دیا گیا ہے۔ نکاح کو سنّت اور نصف ایمان بتایا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور مخلوق کی خدمت کو خالق کی خوشنودی کا باعث کہا گیا ہے اور برابر یہ یاد دلایا جاتا رہا ہے کہ انسان کا اصل منصب نیابت الٰہی ہے منشائے ایزدی کی بجاآوری اس کا اولین فرض ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے حضرت داؤدؑ کا ایک واقعہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت داؤد کو عبادت اور مناجات کا بیحد شوق تھا۔ روزہ نماز اور دعاؤں میں ان کا اکثر وقت گزرتا۔ پھر ایسا ہوا کہ اللہ نے ان کو حکومت عطا فرمائی۔ اس کے بعد انھوں نے تقسیم کار اس طرح کی کہ ایک دن سلطنت کا کام کرتے تھے اور ایک دن گھر کے دروازے بند کرکے تسبیح و تہلیل اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ ایک مرتبہ عبادت و ریاضت کے لیے جو دن انھوں نے مقرر کیا تھا اس میں دو آدمیوں کے درمیان اختلاف ہوا ایک شخص کے پاس ۹۹ دنبیاں تھیں اور دوسرے کے پاس صرف ایک دنبی تھی۔ ننانوے دنبیوں کے مالک نے ایک والے سے کہا کہ تو ایک رکھ کر کیا کرے گا۔ یہ بھی مجھے دیدے تاکہ میرا سیکڑہ پورا ہو جائے۔ اس غریب کی منّت و سماجت جب بے اثر رہی تو حضرت داؤد کے پاس آکر معاملہ پیش کرنا چاہا۔ مگر جب وہاں پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ پکارنے اور دستک دینے سے دروازہ نہ کھلا تو دونوں دیوار پھاند کر اندر آئے۔ حضرت داؤد اس طرح اچانک پھاند کر آنے سے گھبرائے کہ کہیں کوئی دشمن نہ ہو لیکن ان لوگوں نے کہا پریشان نہ ہوجیے ہم لوگ ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں۔ حضرت داؤدؑ نے اس کا مناسب فیصلہ کیا لیکن انھیں محسوس ہوا کہ حکومت کی ذمہ داری کے بعد عبادت و ریاضت میں یہ

انہماک صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کو بیان کر کے اللہ نے ان کے فرائضِ منصبی کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اے داؤد ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔

خود خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید تھی کہ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ	جب آپ فرائض رسالت سے) فارغ ہو جائیں تو (عبادت خاصہ کے لیے) کھڑے ہوں اور اپنے رب کی طرف راغب ہوں۔

دنیا سے خرابیوں کو دور کرنا، برائیوں کو مٹانا، نظامِ عدل کو قائم کرنا اور نوعِ انسانی کے لیے خیر و فلاح کی تدبیر کرنا یہ مومنین کی زندگی کا اہم مقصد ہے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے میں قدم قدم پر مشکلات و مصائب پیش آتے ہیں اور ہوا و ہوس کے دلفریب مناظر راہ میں حائل ہوتے ہیں ان سے محفوظ رہنے کے لیے رجوع الی اللہ ناگزیر ہے اور تسبیح و تہلیل، اوراد و وظائف اور نماز روزہ رجوع الی اللہ کے موثر ذرائع ہیں۔

یاایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصٰبرین۔	اے ایمان والو! نماز اور صبر سے قوت حاصل کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اور یقین رکھو کہ:

ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون	اللہ قطعاً ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی اور جو نیکوکار ہیں۔

روح قرآن

یہ قرآن شریف کی سب سے پہلی سورۃ ہے۔ اس لیے فاتحہ (کھولنے والی) کہتے ہیں۔ تمام قرآن مجید میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اُس کا خلاصہ چند سطروں میں اس خوبی کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر سارے قرآن شریف کے مضامین ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اُمّ القرآن بھی کہتے ہیں۔ گویا کہ جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اُسی طرح سارا قرآن مجید اس مختصر سی سورۃ میں سما گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے اس جانب توجہ دلائی ہے اور اسے القرآن العظیم قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے لوگوں کے سامنے اس کی بزرگی بیان کی ہے۔ حضرت ابوسعید ابن المعلّٰی رضی اللہ عنہ، کا بیان ہے کہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں نماز کی وجہ سے جواب نہ دے سکا نماز پڑھ چکنے کے بعد حاضر خدمت ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کس وجہ سے تم میرے پاس نہیں آئے میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں ہے کہ :-

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ	اے مومنو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو جب وہ (رسول) تم کو ایسے کام کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشتا ہے۔ (انفال رکوع ۳)

پھر فرمایا تمھارے مسجد سے نکلنے سے پہلے میں تمھیں قرآن مجید کی سب سے بڑی سورت سکھاؤں گا اُس کے بعد میرا ہاتھ پکڑا۔ جب مسجد سے نکلنے کا ارادہ

کیا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ تمہیں سکھاؤں گا۔ فرمایا۔ ہاں۔ الحمد للہ رب العلمین، یہی وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ یہی وہ قرآنِ عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے (صحیح بخاری)

حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ دوسرے صحابہ سے بھی یہی ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ اس کے مثل نہ تو تورات میں ہے نہ انجیل میں ہے نہ زبور میں ہے نہ قرآن میں ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے اسے نماز میں پڑھنے کی تاکید کی اور اُس نماز کو ناقص قرار دیا جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کوئی نماز پڑھی اور اُس میں اُمّ القرآن (سورۂ فاتحہ) نہیں پڑھی تو وہ نماز ناقص ہے (صحیح مسلم)

اس تاکید کا مقصد یہ ہے کہ روزانہ نمازوں میں پڑھنے کی وجہ سے بار بار یہ سورت سامنے آتی رہے اور قرآن مجید کے مضامین برابر ذہن میں تازہ رہیں اور اُن پر عمل کی ترغیب ہوتی رہے۔

یہ سورت شروع کرنے سے پہلے بلکہ قرآن مجید شروع کرنے سے پہلے اَعُوذُ باللّٰہِ من الشیطٰنِ الرجیم کہنا چاہیے۔ تاکہ دل خدا کی طرف متوجہ ہو اور راہِ حق سے پھیرنے والے شیطان سے محفوظ رہے۔ اعوذ کے معنی التجا اور پناہ مانگنے کے ہیں ب۔ کسی چیز سے ملا اور لگا دینے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اَعُوْذُ کہتے ہی ذہن میں یہ خیال آجاتا ہے کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس کی رحمت وحفاظت کا طلبگار ہوں اور اپنی ذات کو اس کی حفظ ورحمت کے ساتھ ملائے دیتا ہوں۔ شیطان شطن سے بنا ہے۔ شطن کہتے ہیں دوری کو، مطلب یہ ہوا کہ میں اُس کے مقابلہ میں جو راہ حق سے دور اور رحمتِ الٰہی سے مردود ہے۔ اللہ کی حفاظت چاہتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو اس زبردست دشمن کے مقابلہ میں اللہ کی رحمت اور حفاظت کے سایہ میں کیے دیتا ہوں۔ اس طرح غور کیجیے کہ اس مختصر سے فقرے میں کیسی گہری معنوی

قوت موجود ہے۔ انسان کو اپنی لاعلمی، بیچارگی اور کمزوری کا گہرا احساس ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا علم بے حد ناقص اور میری قوت بہت محدود ہے نہ مجھے کسی نقصان کے دور کرنے کی قدرت ہے نہ کسی نفع کے حاصل کرنے کی قوت، اللہ ہی چاہے تو میری کشتی مشکلات کے طوفان سے صحیح سلامت پار ہو سکتی ہے۔ یہ احساس انسان کے دل سے تکبّر دور کرتا ہے اور اس کے اندر عاجزی اور انکسار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ عاجز و درماندہ ہو کر خدا کے سامنے جھک جاتا ہے اور بہت ہی گڑ گڑا کر اُس سے دعا مانگتا ہے اس موقع پر بندگی کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اور انسان اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ خدا کے سہارے کے بغیر وہ کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

اس تشریح کے بعد خیال کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے آغاز سے پہلے اعوذ باللہ کہنا کس قدر مناسب ہے کتاب الٰہی کی تلاوت سے مقصود یہ ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کی وہ راہ معلوم ہو جو اس عالم کے بنانے والے نے اس کے لیے تجویز کی ہے۔ اگر انسان اپنی کمزوریوں سے واقف ہے اپنے علم کی کمی کو جانتا اور اپنی عاجزی و بیچارگی کو سمجھتا ہے تو وہ نفس کے دھوکے میں آئے گا نہ شیطان کے فریب میں مبتلا ہو گا بلکہ بے چون چرا اپنے کو اللہ کے حوالے کر دے گا۔ اور ایک فرمانبردار اور سعادت مند غلام کی طرح اُس کے احکام پر عمل کرے گا۔ اس ذہنیت کے ساتھ جب کوئی قرآن مجید کی تلاوت شروع کرے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری رہنمائی حاصل ہو گی۔ اُس کے لیے قدم قدم پر عمل کے دروازے کھلیں گے اور وہ ایک علیم و بصیر ذات کی رہنمائی میں زندگی کی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کرے گا۔

اعوذ باللہ کے بعد ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہیں تاکہ شیطان رجیم کے بعد اللہ تعالیٰ کا نام زبان پر آجائے اور دل اُس کی عظمت و شان اور اس کی قدرت و جلال کے تصور سے لبریز ہو جائے اور اُس کی یاد شیطانی وسوسوں

کے لیے تریاق کا کام کرے۔ اس موقع پر اس کی رحمت و مہربانی کا خاص طور پر ذکر کیا جا رہا ہے۔ تاکہ انسانی کمزوریوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دستگیری کی آس بندھے۔ اور اس کے رحم و کرم کے بھروسے اور اُس کی امداد و اعانت کے سہارے صحیح راہ کی طرف قدم اُٹھ سکیں اور کمزور و بے بس انسان نفس و شیطان کے وسوسوں اور سازشوں کے مقابلے میں رحمتِ الٰہی کا سہارا محسوس کرے۔

اس موقع پر رحمٰن و رحیم دو لفظ استعمال ہوئے ہیں دونوں لفظ رحم و مہربانی کی غیر معمولی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ رحمٰن اُس ذات کو کہتے ہیں جس کا جذبۂ رحم بے حد اور جسکی مہربانی لاانتہا ہو رحیم اُس ذات کو کہتے ہیں جو رحم سے بھرپور ہو۔ لطف و کرم اور عنایت رحمت کی صفات اس طرح اس کی حقیقت میں داخل ہوں کہ کبھی اُس سے جُدا نہ ہو سکیں بلکہ ہمیشہ اُس ذات کے ساتھ رحم و محبت اس طرح وابستہ رہیں کہ جہاں وہ پائی جائے رحمت و مہربانی ہی پائی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ رحمت اللہ تعالیٰ کی دائمی اور لازوال صفت ہے۔ اُس کی ذات رحیم ہے۔ اس کے کاموں میں رحمت کا غلبہ ہے اور اس کے افعال میں مہربانی کا غیر معمولی ظہور ہے۔ اس سلسلہ میں عربی زبان کے ماہر ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن عام اور وسیع صفت ہے لیکن رحیم صفت خاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت مومن و کافر اور نیک و بد سب کے لیے عام ہے اور ساری کائنات اس کی مہربانی سے فائدہ اُٹھاتی ہے۔ لیکن اپنے نیکوں اور ایماندار بندوں پر اُس کی نظرِ خاص رہتی ہے دُنیا میں اُس کی رحمانیت کے جلوے نظر آتے ہیں اور آخرت میں اُس کی شانِ رحیمی کے کرشمے نظر آئیں گے۔

الحمد للہ، اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد اصل سورت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سورت کو شروع کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ سورت اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان میں نازل فرمائی ہے۔ تاکہ وہ بہترین الفاظ میں خدا کے سامنے عرض و نیاز کر سکیں۔ دنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ حکومتوں اور محکموں کی

طرف سے درخواستوں کے لیے الفاظ متعین کر دیے جاتے ہیں اور ہر موقع کے لیے درخواست کے فارم تیار ملتے ہیں۔ تاکہ کسی شخص کو اظہار مدعا میں کوئی دشواری نہ ہو بلکہ آسانی کے ساتھ مقررہ فارم کی خانہ پری کر کے اپنا مطلب حاکم کے گوش گزار کر سکیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ سورت بندوں کی درخواست کے لیے نازل فرمائی ہے۔ اسی لیے اس میں ایسے الفاظ اور جملے استعمال کیے گئے ہیں جو ایک عرضی دہندہ حاکم کے سامنے اپنی درخواست پیش کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔ البتہ دنیاوی حاکموں کے یہاں جو درخواستوں کے فارم ملتے ہیں۔ وہ ایک خاص طرز پر اظہار مدعا کا کام دیتے ہیں۔ اُن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ اُن کے اندر حکومت کے قوانین وضوابط کا خلاصہ اس طرح موجود ہو کہ ان الفاظ کو پڑھ کر حکومت کا آئین و دستور ذہن میں آجائے اور اُسے کام میں لانے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ ساتھ ہی ذہن و دماغ پر ایسا اثر پڑے کہ برائیوں اور بے قاعدگیوں سے بچنے کا گہرا جذبہ اور نیک عملی کا سچا عزم پیدا ہو لیکن سورت فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے درخواست کے مضمون کے ساتھ یہ خوبی بھی رکھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے چند فقروں میں اسلام کے پورے نظام کا خلاصہ اس طرح آگیا ہے کہ ہر ہر لفظ اسلامی تصورات کی ایک دلآویز تصویر بن گیا ہے۔ ساتھ ہی اللہ کے اُن نیک بندوں کی سرگزشت بھی سامنے آجاتی ہے جنھوں نے قوانین ربانی پر عمل کر کے اپنے آپ کو انعام واکرام کا مستحق بنایا۔ اُن کے پہلو بہ پہلو اُن بداطوار انسانوں کا عبرت انگیز انجام بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جنہوں نے اپنی نافرمانی اور بدکرداری سے اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مستحق بنایا اور ذلالت وگمراہی میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔

سورۃ کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے ہوتا ہے۔ اس موقع پر شکر و مدح کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے کیونکہ شکر ایسی نعمت پر کیا جاتا ہے۔ جس کا اثر کہنے والے تک پہنچا ہو۔ اور ممدوح کے لیے ذی عقل ذی اختیار اور زندہ وقائم ذات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ بے اختیار اور بے جان چیزوں کی بھی مدح کی

جاسکتی ہے۔ ممدوح کے لیے زندہ ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ جو مر چکا ہے اس کی بھی مدح کی جاسکتی ہے۔ مدح کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ممدوح کی جو صفت بتائی جارہی ہے وہ اُس کی اپنی کوشش اور اپنے اختیار سے بلکہ ہوسکتا ہے کسی ایسی صفت کی بنیاد پر مدح کی جارہی ہو جس پر اُسے کوئی اختیار نہ ہو۔ مثلاً آپ کسی شخص کی حسن قامت یا خوش آوازی کی بنا پر مدح کر سکتے ہیں۔ حالانکہ نہ حسنِ قامت اُس کے اختیار سے ہے اور نہ خوش آوازی، یہ صفات اُس کی کوشش کے بغیر اُسے پیدائشی طور پر حاصل ہیں۔ مدح اور حمد کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ مدح کے لیے ضروری نہیں ہے کہ انعام اکرام پہلے سے حاصل ہو چکا ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ حصول سے پہلے مدح کی جائے۔ لیکن حمد کے لیے انعام احسان پہلے سے ضروری ہے۔

مذکورہ بالا اشارات کے بعد خیال کیجئے کہ اس موقع پر ایک لفظ 'حمد' سے کتنے گہرے اور وسیع معنی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف لفظِ اللہ ذاتِ الٰہی کی اُن غیر محدود وسعتوں کی طرف ذہنِ انسانی کو لے جاتا ہے جن کے ادراک و تعقّل سے عقل عاجز اور جہاں تک پہنچنے سے فہم حیران ہے۔ انسان کا ذہن اتنی جولانی کے باوجود ذاتِ الٰہی کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے وہ جس قدر اس ذات پر غور کرتا ہے اُسی قدر اُس کے سامنے اس کی فکر کی نارسائی اور اس کی فہم کا قصور نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ ہماری عقل وفہم سے بلند ہمارے خیال وقیاس سے برتر اور ہمارے وہم وگمان سے بہت دُور ذات کی تعریف کے لیے بھی کسی غیر محدود ولانہایت صفت کی ضرورت تھی۔ اس لیے تمام توصیفی الفاظ کے بجائے حمد کا لفظ استعمال کیا گیا اور اُس پر لِلّٰ کا اضافہ کیا گیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی تعریف وتوصیف کے لائق ہے۔ جتنی بھی خوبیاں ہوسکتی ہیں وہ سب اُس میں پائی جاتی ہیں اور اُس کی ذات ہر قسم کے حسن وکمال کی جامع ہے۔ پھر یہ تمام خوبیاں اُس کے اختیار وارادہ سے ہیں اور اس کے اثر واقتدار

کے ماتحت ہیں۔ ایک بندے کی زبان سے جب یہ لفظ ادا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی
لاانتہا قوتوں اور قدرتوں کا خیال اُس کی غیر معمولی بلندی و برتری کا تصور اور اس کی
بے پایاں عظمت و جلال کا احساس ایک طرف اُسے اپنی بے حقیقتی کا یقین دلاتا ہے
اور وہ اپنے کو عاجز و درماندہ اور بے کس و لاچار سمجھ کر خدا کے سامنے سرافگندگی
پر مجبور پاتا ہے۔ دوسری طرف اس احساس عجز نثار کے ساتھ جب یہ خیال ہوتا ہے کہ
وہ ایسی عظیم و جلیل اور بلند و برتر ذات سے غلامی کی نسبت رکھتا ہے۔ جس کی قوتیں
غیر محدود اور جس کے اختیار بے انتہا ہیں تو اُسے اپنے شرف و عزت کا احساس ہوتا
ہے اور وہ سوچتا ہے کہ ایسی بلند و برتر ذات سے بندگی کا تعلق رکھنے کے بعد اب
ساری کائنات میں کسی کے سامنے مجھے سربسجود ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ
کے آستانے پر سر جھکانے کے بعد اور اس کی بندگی کا شرف حاصل کرنے کے بعد جو
عزت مجھے حاصل ہوئی ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ سر اب کسی اور کے آگے نہ جھکے
خالق کی غلامی کے بعد مخلوق کی آقائی حاصل ہو جاتی ہے اور سرنگونی کے بجائے
سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ حمد صفت کمال ہے اور لل یہ ظاہر
کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی خوبیوں اور تمام کمالات کی جامع ہے ذات
الٰہی کی یہ محمودیت اور اس کے جمال و کمال کی جامعیت دل میں بے انتہا محبت و
گرویدگی اور عشق و شیفتگی پیدا کرتی ہے انسان بے اختیار اُس کی طرف کھنچتا ہے
اور اُس کی محبت جسم کے ریشہ ریشہ میں سما جاتی ہے۔ اس کے ساتھ جب حمد
کا یہ مفہوم پیش نظر ہو کہ حمد کا لفظ اسی موقع پر استعمال کیا جا سکتا ہے جب پہلے
انعام و اکرام حاصل ہو چکا ہو اور اس کی یہ کرم فرمائی کسی ایک ذرے کے ساتھ محدود
نہیں بلکہ ساری مخلوق اس کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں سے مستفید ہو رہی ہے۔ اس
طرح ایک طرف اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کا وسیع تصور ذہن میں آتا ہے۔ دوسری
طرف انسان کے ذہن میں تنگی کے بجائے وسعت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات
کے فائدے کے بجائے ساری کائنات کے نفع سے مسرور ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو

دوسروں کے ساتھ اس طرح سمو دیتا ہے کہ دوسروں کی خوشی اُسے عین اپنی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ حمد کا لفظ متکلم کے صیغے میں استعمال نہیں کیا گیا یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں۔ تاکہ اس موقع پر کہیں سے انانیت کا کوئی رنگ نہ جھلک سکے نہ یہ وہم ہو سکے کہ خدا کی حمد کے لیے کسی واسطے کی ضرورت ہے بلکہ اس حقیقت کا واضح اعلان ہو کہ خدا کی ذات محمود ہے ہر قسم کی تعریف و توصیف اُسی کا حق ہے خواہ کوئی یہ حق ادا کرے یا نہ کرے وہ بہر حال لایق ستائش ہے اور ہر قسم کی مدح و ثنا اُسی کو سزاوار ہے۔ اس جگہ پہنچکر ربّ العٰلمین کے الفاظ سامنے آتے ہیں اور بندے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ الٰہی صرف یہی نہیں کہ ہر قسم کی خوبیوں اور کمالات کی جامع ہے۔ بلکہ اُس کا تعلق ہم سے بھی ہے اور ایسا گہرا تعلق ہے کہ اُس کے بغیر ہمارا قائم رہنا ناممکن ہے۔ اُسی نے ہمیں پیدا کیا اور وہی ہماری پرورش فرماتا ہے۔ اُسی کی ربوبیت کے سائے میں ہم زندگی کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اور اُسی کی تربیت سے اس تلاطم خیز عالم میں ہمارا سفینۂ حیات گردابِ حوادث سے محفوظ رہتا ہے۔ اُسی کی شانِ پروردگاری ہے کہ چھوٹا سا دانا زمین کی تاریکیوں میں گم ہونے کے بجائے اس طرح قدم جماتا ہے کہ مٹی کی تہوں کو چاک کر کے سطح زمین پر غذا کے خزانے اُگلنے لگتا ہے اور ننھے ننھے قطرے چھن چھن کر زمین کی گہرائیوں میں پانی کے ذخیرے جماتی ہیں۔ اس عنایت و نوازش کے تصور سے عشق و شیفتگی کے ساتھ احسانمندی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور بڑھ جاتا ہے پھر رب کے ساتھ العالمین کا لفظ ذہن میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ آدمی کے دل میں محبّت و ہمدردی کا عالمگیر جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ نسل و قوم ملک و وطن رنگ و نسب کے تنگ دائروں کے بجائے ساری کائنات کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے ربّ العلمین کا پرستار اس کے بندوں کی خدمت کا عہد کرتا ہے اور رحمتہ العلمین کا اُمتی سارے جہانوں کو پیامِ رحمت پہنچانے کا عزم اور سب سے رحم و کرم کا سلوک کرنے

کا ارادہ کرتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ربّ العٰلمین کے بعد الرّحمٰنِ الرحیم کے الفاظ بندے کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اور وہ خیال کرتا ہے کہ میرا پروردگار صرف پرورش ونگہداشت ہی کا سامان نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے اور ان کے ساتھ بڑے ہی رحم وکرم کا برتاؤ کرتا ہے اور غور کرتا ہے تو اُسے قدم قدم پر رحمتِ الٰہی کے جلوے نظر آتے ہیں اپنی طرف دھیان جاتا ہے تو بے شمار مہربانیوں کا خیال آتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ محتاج وبے بس انسان کیسی سرکشی کی راہیں اختیار کیے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اکثر رحم ہی کا برتاؤ ہو رہا ہے انسان کی بیچارگی کا یہ حال ہے کہ نہ اسے اپنی زندگی پر اختیار ہے نہ موت پر نہ بیماری پر نہ تندرستی پر نفع پر نہ نقصان پر، لیکن اس بے اختیاری کے باوجود اس کی سرکشی کا یہ حال ہے کہ ہر وقت خدائی کے خواب دیکھا کرتا ہے اور اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کی بتائی ہوئی ہدایتوں پر عمل کے بجائے شیطانی طریقوں ہی پر چلنا پسند کرتا ہے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُسے ایک دن بھی راحت و آرام نصیب نہ ہوتا اور وہ برابر مصیبت میں مبتلا رہتا لیکن اللہ تعالیٰ کے غیر معمولی رحم وکرم ہی کا صدقہ ہے کہ ہر قسم کی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے باوجود انسان نہ صرف زندہ رہتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتا رہتا ہے۔ آپ اگر اس دُنیا کے حالات پر غور کریں تو صاف نظر آئے گا کہ انسانوں کی ہر قسم کی ناروا حرکتوں کے باوجود مصائب وتکالیف کے مقابلہ میں راحت وآرام کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے ہیں آپ دیکھتے ہیں کہ بیماروں کے مقابلے میں تندرست، بھوکوں کے مقابلے میں پیٹ بھرے اور ننگوں کے مقابلے میں کپڑے پہننے والوں کی تعداد زیادہ ہے لاولدکم ہیں اور صاحبِ اولاد زیادہ ہیں۔ وبا کی مدت کم ہوتی ہے اور صحت کے دن زیادہ ہوتے ہیں نہ پیداداری کا دور زیادہ عرصے تک رہتا ہے۔ قحط سالی کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔ غرض آپ جس پہلو سے غور کریں گے آپ کو یہی نظر آئے گا کہ مصائب ومشکلات کے مقابلہ

میں راحت و آرام کے ایام زیادہ ہوتے ہیں۔ خواہ افراد کی زندگی میں آپ اس کا تجربہ کریں۔ خواہ جماعتوں کے حالات کا مطالعہ کریں ہر جگہ آپ کو قہر کے مقابلے میں مہر اور سزا کے مقابلے میں عفو و درگزر کے مظاہر بہت زیادہ نظر آئیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جلوے ہر جگہ دکھائی دیں گے۔ آپ اپنی زندگی پر غور کریں تو بے شمار مواقع ایسے یاد آئیں گے۔ جہاں زبردست غلطیوں کے باوجود آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ آپ سوچیں گے تو رحمتِ الٰہی کے سوا اس نقصان سے بچانے والی اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی ان غیر معمولی مہربانیوں کی یاد انسان کے اندر اس کی محبت و شیفتگی کے جذبات اور بڑھا دیتی ہے۔

اس موقع پر مالکِ یوم الدّین کے الفاظ زبان پر آتے ہیں اور جزا و سزا کے تصوّر سے محبت کے بڑھتے ہوئے جذبات میں ادب کا اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ ان چند لفظوں کے زبان پر آتے ہی انسان لرز جاتا ہے۔ قیامت کے ہولناک مناظر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اعمال کے بدلے کا خیال اسے متفکر کر دیتا ہے جزا و سزا کے تصوّر سے اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کی پچھلی زندگی کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ میدانِ حشر میں ہے اب وہ اپنے ایک ایک عمل کو ترازو پر تولتا ہے غلطیاں اور کوتاہیاں پہاڑ بن کر سامنے آتی ہیں اور اُسے رحمتِ الٰہی کے سائے کے سوا اور کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی وہ اپنی پچھلی لغزشوں سے توبہ کرتا ہے از سرِ نو نیکی اور پاکبازی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عہد کرتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی غلامی میں دے دیتا ہے اور بڑے تضرع وزاری کے ساتھ اس کے حضور میں عرض کرتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) عبد عربی میں غلام کو کہتے ہیں۔ یہ غلام پورے طور سے آقا کی ملکیت ہوتا ہے اُس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اُس کی ہر چیز پر آقا کو مالکانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ غلام کو کسی قسم کے تصرّف کا

حق نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ آقا کی اجازت کے بغیر وہ خرید و فروخت کا بھی مجاز نہیں ہوتا ایاکَ نعبدُ کہہ کر مومن اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ وہ سعادت مند غلام کی طرح بے چوں چرا احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا۔ اپنی ذات اپنی املاک اپنی اولاد کسی پر اُسے خود مختارانہ اختیارات حاصل نہیں ہے بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اس کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہر ایک کے ساتھ برتاؤ کرے۔ بندگی کے اقرار کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ بھی اقرار کیا جا رہا ہے کہ ہم تیرے سوا اور کسی سے اعانت کے طالب نہیں ہیں۔ ہمیں زندگی کے اس منجدھار سے صحیح سلامت گزرنے کے لیے تیرے ہی سہارے کی ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کشتی حیات کا ساحل مراد تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس موقع پر ایاکَ پہلے لانے سے کلام میں زور پیدا ہوگیا ہے۔ ایک طرف بندہ کی طرف سے اظہار ہے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کا تصوّر اپنی پوری عظمت وجلال کے ساتھ سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں انانیت کے بجائے نیازمندی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اس کے پہلے لانے سے یہ فائدہ ہوا کہ عبدیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کی شرکت کی گنجائش نہیں رہی نہ امداد کی درخواست کا رُخ کسی اور کی طرف ہوسکتا ہے بلکہ بندہ صاف صاف اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ اس طرح ہر قسم کے شرک کی جڑ کٹ گئی۔ اس اقرار کے بعد مومن نہ کسی اور کے آگے سر جھکا سکتا ہے نہ کسی اور سے مدد مانگ سکتا ہے۔ اس موقع پر بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف پورے طور پر رجوع ہوتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ خدایا اس اقرار کے مطابق مجھے صحیح زندگی بسر کرنے کی توفیق بخش میرے سامنے سیدھی راہ نمایاں کردے اور نفسِ شیطان کے چنگل سے چھڑا کر مجھے اس راستے پر چلنے کی طاقت دے جو تیرے نیک بندوں کی راہ ہے جس پر تیرے نبی تیرے صدیق تیرے شہید اور تیرے صالح بندے چلے ہیں اُسی راہ پر مجھے بھی چلا اس

راہ پر میرے قدم نہ پڑنے پائیں جوان لوگوں نے اختیار کی تھی جو غضب کے مستحق ہوئے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی تفسیر خود قرآن مجید میں مذکور ہے۔ سورۂ نساء میں جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے۔ اُن کی تفسیر نبیوں صدیقوں شہیدوں اور نیکوکاروں سے کی گئی ہے۔ اس طرح یہود کو مختلف مقامات پر مغضوب اور نصاریٰ کو ضال (گمراہ) کہا گیا ہے۔ حدیث میں بھی اس کی تائید ہے حضرت عدی ابن حاتم حضرت ابوذر رضؓ اور حضرت عبداللہ رضؓ ابن عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے یہود کو مغضوب اور نصاریٰ کو ضال گمراہ قرار دیا ہے۔ (ابن کثیر بحوالہ ترمذی، مسند احمد)

یہود کی زندگی عملی کوتاہیوں اور نافرمانیوں کی مثال ہے۔ اور نصاریٰ خرابی اعتقاد کا نمونہ ہیں۔ عمل کی خرابی عزت و سربلندی سے محرومی کا باعث ہے اور اعتقاد کا فساد اخلاقی تنزل کا سبب ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کے تذکروں کے پہلو بہ پہلو گمراہ اور مغضوب انسانوں کا تذکرہ بکثرت کیا گیا ہے اور اول الذکر کی کامیابی اور آخر الذکر کی ناکامی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ان حالات کو سُن کر برائی سے اجتناب اور نیکی کی جانب رغبت کا جذبہ پیدا ہو اور یہ یقین ہو جائے کہ حق کے مقابلے میں باطل کا ٹھہرنا ناممکن ہے۔ خواہ وہ عارضی طور پر کتنا ہی سربلند نظر آئے لیکن بالآخر حق کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ بدی بظاہر کیسی ہی بافروغ نظر آئے لیکن انجام کار نیکی ہی کو سربلندی نصیب ہو گی۔

قرآن مجید میں یہ واقعات اس زور و قوت اور ایسی تفصیل و وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے کہ مسلمانوں پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور اُن کے دل میں حق کی سربلندی اور باطل کی سرنگونی کا ایسا پختہ یقین پیدا ہو گیا جو انتہائی

تاریک ماحول میں بھی اُن کے لیے شمع راہ رہا اور جس کی بدولت اُن کے سینے مایوسیوں کے عین ہجوم میں حق کی سربلندی کے تصور سے معمور رہے۔ اُنھوں نے یاس و نااُمیدی کو کبھی پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اُن کے حوصلے ہمیشہ بلند رہے اور شبِ تاریک میں ہم نفس اُفق پر نکلتے ہوئے سورج کی تابانی محسوس ہوئی۔ صحابۂ کرام اور اُن کے متبعین کے حالات آج بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں پہلے اُنھوں نے ایمان و عمل صالح کی صفات سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے انعامِ الٰہی کا مستحق بنایا۔ اس کے بعد اس پیغامِ حق کو لے کر آگے بڑھے اور گنتی کے چند برسوں میں دُنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

غرض میں کیا کہوں تم سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا

☆

راہِ ہدایت

ہدایت نہایت ہوشیاری اور وقتِ نظر کے ساتھ رہنمائی کرنے کو کہتے ہیں جس طرح اردو میں رہنمائی منزلِ مقصود کی سمت راہ دکھانے کو بھی کہتے ہیں اور منزل تک لے جاکر پہنچا دینے کو بھی کہتے ہیں، ویسے عربی میں ہدایت دونوں معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس جگہ منزلِ مقصود تک پہنچا دینا مراد ہے۔ قرآن مجید راستہ تو سب ہی کو دکھاتا ہے۔ وہ ھدی للناس (سارے لوگوں کے لیے ہدایت) بھی ہے اور ھدی للعالمین (سارے جہانوں کے لیے ہدایت) بھی۔ لیکن منزلِ مقصود تک وہی لوگ پہنچتے ہیں جو خوش دلی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں زندگی کی راہ طے کرتے ہیں۔ روزمرہ کے حالات پر غور کیجیے۔ راہبر راہ سب کو بتا سکتا ہے لیکن جب تک ہم اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا شروع نہ کردیں منزلِ مقصود تک کیسے پہنچ سکتے ہیں یہی حال اسلام کی صراطِ مستقیم کا ہے۔ اللہ تعالیٰ خواہ کیسی ہی وضاحت کے ساتھ ہمیں صحیح راہ بتائے لیکن اگر ہم اس بتائی ہوئی سیدھی راہ پر نہ چلیں گے تو کامیابی کی منزل تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اس آیت ھدی للمتقین میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ صحیح منزل تک پہنچنے کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے۔ اس جگہ قرآن مجید کی غیر معمولی رہبرانہ صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لیے ھادی کے بجائے ھدیً کہا گیا ہے۔ اہلِ زبان اس بلیغ

فرق کو خوب محسوس کرتے ہیں۔ ھادی اس ذات کو کہتے ہیں جس میں ہدایت کی صفت پائی جاتی ہے یعنی ہدایت ہادی کی ذات کے ضمن میں پائی جاتی ہے اس طرح ہادی کی ذات تو اصل ہوئی اور صفت ہدایت ضمنی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو ضمنی کے بجائے اصل قرار دینے کے لیے ہادی کی جگہ ھدیً استعمال کیا ہے تاکہ قرآن مجید میں ہدایت کوئی ضمنی صفت نہ معلوم ہو بلکہ یہ ظاہر ہو کہ قرآن از سرتا پا ہدایت اور مجسم رہنمائی ہے۔

متقی ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور عملی زندگی میں گناہوں سے بچتا ہو۔ تقوٰے میں خشیتِ الٰہی کے ساتھ گناہوں سے پرہیز اور واجبات کی ادائیگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس طرح ایمان، اخلاص، اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ، اس کی اطاعت، معصیت سے اجتناب سبھی صفات تقوٰے کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ان تمام معانی میں قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں تقوٰے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: الزمھم کلمۃ التقوے (اللہ نے ان کو ایمان پر جمائے رکھا) میں تقوٰے ایمان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فانھا من تقوی القلوب (وہ دلوں کے اخلاص سے ہے) میں تقوٰے اخلاص کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یا ایھا الناس اتقوا ربکم (اے لوگوں اپنے رب سے ڈرو) میں تقوٰے خشیت الٰہی کے معنی میں بولا گیا ہے۔ مختلف احادیث میں بھی تقوٰے کی اسی وسعت اور جامعیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا۔ متقی وہ لوگ ہیں جو شرک و بُت پرستی سے پرہیز کریں اور بندگی خالص اللہ ہی کی کریں (ابن ابی حاتم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تقوٰی کا حقیقی مزہ وہی حاصل کر سکتا ہے جو کسی ایسی چیز کے خوف سے جس میں کوئی حرج نہ ہو۔ لیکن اس کے کرنے سے گناہ میں مبتلا ہونے کا

خوف ہو تو متقی آدمی کی شان یہ ہے کہ وہ اس سے بھی پرہیز کرے (ترمذی)
حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ متقی وہ لوگ ہیں جو کبھی راہ ہدایت ترک ہو جانے پر اللہ تعالیٰ کی بازپرس اور سزا سے ڈرتے ہیں اور دین حق قبول کرنے کی وجہ سے اُس کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں اور وہ فرائض ادا کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ (ابن کثیر) انھیں حسن بصری سے یہ منقول ہے کہ تقویٰ کی شان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر کسی اور کو ترجیح نہ دو اور اس حقیقت پر دل و جان سے یقین رکھو کہ تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ حضرت ابراہیم ادھم کہتے ہیں کہ تقویٰ اسی کا نام ہے کہ مخلوق تمھاری زبان میں کوئی عیب نہ پائے، فرشتے تمھارے افعال میں کوئی عیب نہ دیکھیں اور صاحب عرش تمھارے دل کے پوشیدہ گوشوں میں کوئی عیب نہ محسوس کرے، ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ تقوٰے اُسے کہتے ہیں کہ تم اپنی اندرونی کیفیات اور پوشیدہ خیالات کو اللہ کے سامنے اس طرح مرصع کرو جس طرح مخلوق کے سامنے اپنے ظاہر کو مزین اور آراستہ کرتے ہو۔

تقوٰے کا تقاضا ہے کہ تمھارا آقا (خدا) تمھیں ایسی جگہ نہ دیکھے جہاں سے اس نے منع کیا ہے۔ اللہ کی پسندیدہ راہ اختیار کرو۔ دنیا کو پس پشت ڈال دو۔ حرام سے اجتناب کرو اور اپنے آپ کو اللہ کی وفاداری اور اخلاص کے لیے تیار کرو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

التقوىٰ ترك الاصرار على المعصية وترك الاغترار بالطاعة

تقوٰے نام ہے معصیت پر اصرار نہ کرنے اور طاعت پر گھمنڈ نہ کرنے کا۔

تقوٰے کے ان تمام پہلوؤں کی جانب بڑی خوبی کے ساتھ حضرت اُبَی بن کعبؓ نے چند لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ ان سے حضرت عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا کہ تقوٰے کا مفہوم کیا ہے۔ حضرت اُبیؓ بن کعبؓ نے کہا آپ کسی خار دار راہ سے گزرے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا ہاں، حضرت ابیؓ رضی اللہ عنہ نے پوچھا۔ ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نے اپنا دامن سمیٹا اور احتیاط و توجہ کے ساتھ نکل گیا حضرت ابیؓ نے کہا بس تقویٰ یہی ہے (ابن کثیر) یعنی زندگی کی راہ میں جو گناہوں اور آلائشوں کے کانٹوں سے بھری ہوئی ہے ایمان و دیانت کو بچا کر چلنا تقویٰ ہے۔

تقوٰے کی تفسیر اگلی سطور میں گزر چکی ہے یہ انسان کے لیے عزت و شرف کا ایسا مقام ہے۔ جس پر پہنچ کر اُسے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (اللہ تعالیٰ یقیناً ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقوٰے اور نیک عمل کی راہ اختیار کی۔)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے معزز وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے اس سلسلہ میں کیا خوب فرمایا ہے۔

جو چاہتا ہو کہ اسے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عزت اور قوت حاصل ہو تو اُسے چاہیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے۔ جو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ غنی بننا چاہتا ہو اُسے چاہیے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اُس سے زیادہ اُسے اس پر بھروسہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (وہ ایسے لوگ ہیں جو (محض نبی کے کہنے سے) ان حقائق پر ایمان لے آتے ہیں جو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

تقوٰے کے ذکر کے بعد اُن صفات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جنھیں اختیار

کرنے کے بعد انسان اپنی زندگی کا یہ سفر کامیابی کے ساتھ طے کرکے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

کتابِ حکیم نے بہت ہی بلاغت اور حسنِ ترتیب کے ساتھ پہلے تقوے کا ذکر کرکے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور پیدا کیا پھر اسے گناہوں اور لغزشوں سے بچنے کی ترغیب دی اور اس کے دل میں صحیح راہ پر چلنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو پیدا کی۔ جب نیک عمل کا ولولہ دل کے اندر پیدا ہوگیا تو ایمان وعملِ صالح کی جانب توجہ دلائی گئی۔ اس سلسلے میں پہلے ان غیبی حقائق کا ذکر کیا گیا جن پر یقین کے بغیر نہ زندگی خیر وخوبی کے ساتھ بسر ہوسکتی ہے نہ مرنے کے بعد راحت وآرام حاصل ہوسکتا ہے۔

اسلام زندگی کو مسلسل مانتا ہے اس کے نزدیک ایک مرتبہ پیدائش کے بعد انسان کو پھر فنا نہیں بقول امام غزالیؒ کے انسان اگرچہ ازلی نہیں ہے لیکن وہ ابدی ضرور ہے۔ موت انسان کو فنا نہیں کرتی بلکہ دوسری زندگی عطا کرتی ہے۔ ایک طرف آنکھیں بند ہوتی ہیں تو دوسری طرف آنکھیں کھلتی ہیں یہ عالمِ مادی اصلی عالم نہیں ہے۔ بلکہ اصلی عالم کی گذرگاہ ہے۔ اس عالمِ فانی سے گذر کر انسان اس عالمِ جاودانی میں قدم رکھتا ہے جو ہماری مادّی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اسے ہم اُس وقت دیکھ سکیں گے جب مادی کثافت دور ہوگی اس عالمِ مادّی سے جدا ہوکر ہم اس عالمِ روحانی میں قدم رکھیں گے۔

اس غیبی حقیقت کو تسلیم کیے بغیر ہماری زندگی کی کوئی چول صحیح نہیں بیٹھ سکتی مرنے کے بعد کی کامیابی کا کیا ذکر ہے۔ ایمان بالغیب کے بغیر ہمارے روزمرہ کے کام بھی صحیح طریقے سے انجام نہیں پا سکتے۔ اس دنیا کی زندگی جس طرح محدود ہے اسی طرح یہاں سامانِ زندگی بھی محدود ہے اور انسان کا حال یہ ہے کہ اس کی خواہشیں لامحدود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر گوشہ میں سخت کشمکش برپا ہے۔ ہر انسان دوسرے کو دبانے اور کچلنے میں مصروف ہے اور چاہتا ہے کہ ساری

راحتیں اسی کے حصے میں آجائیں ۔ اس کشمکش کو ختم کرنے اور ایک انسان کی دوسرے انسان کے برخلاف زیادتی کو روکنے کے لیے زندگی کے ضابطے بنائے گئے اور ان ضابطوں کے نافذ کرنے کے لیے حکومتوں کی بنیاد پڑی اور قانون وضع کیے گئے ۔ لیکن چونکہ حکومتوں کی باگ ڈور بھی انسانوں کے ہاتھ میں ہے اور قانون کی تیاری اور ان کا نفاذ بھی اُنھیں کے سپرد ہے اس لیے پورا پورا عدل و انصاف نہیں ہو پاتا بلکہ ہر موقع پر اغراض و مصالح کا اثر ظاہر ہوتا ہے ۔ جس کی وجہ سے محکوموں اور زیردستوں کو شکایت پیدا ہوتی ہے اور حاکم و محکوم کے درمیان سخت کشمکش برپا ہو جاتی ہے ۔ جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں لیکن کسی انقلاب کے بعد لوگوں کو سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ برابر کشاکش اور مقابلے کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس کی وجہ سے نوعِ انسانی کو کبھی بھی راحت و اطمینان اور امن و سکون حاصل نہیں ہوتا ۔

لیکن اگر اتفاق سے کبھی کوئی ایسا طبقہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے جو ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر نوعِ انسانی کی خدمت کرنا چاہتا ہے تب بھی خالص مادی ذہن رکھنے والے اور محض اس جہانِ فانی کو سب کچھ سمجھنے والے انسانوں کے لیے ناممکن ہے کہ وہ سکون سے زندگی بسر کر سکیں ۔ قانون اور طاقت کے زور سے اُنھیں پورے طور پر راہِ راست پر چلانا ناممکن ہے ۔ حکومت کے خوف سے وہ کھلم کھلا قانون کی خلاف ورزی نہیں کریں گے ۔ لیکن حاکم کی نظر سے ہٹ کر خلوت کے موقعوں میں اُنھیں خطاؤں اور غلط کاموں سے کون روک سکتا ہے اور تنہائی کے لمحوں میں اُن کے قلب و ضمیر کو کس طرح گناہ کے ارادہ سے باز رکھا جا سکتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کا ظاہر پابندِ آئین ہوتا ہے اور اُن کا باطن قانون شکنی کے لیے ہر لمحہ تیار رہتا ہے ۔ نوعِ انسانی کو راحت و اطمینان اور امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ ایک ہمہ گیر ہمہ داں اور ہمہ بیں طاقت پر ایمان لائے اور ہر لمحہ یقین رکھے کہ خلوت و جلوت

کی ہر بات دل کا ہر خیال اور نفس کا ہر ارادہ اس بالاتر ذات کی نظر کے سامنے ہے جسے ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن جو ہمیں ہر وقت دیکھتی رہتی ہے۔ وہ لامحدود قدرتوں کی مالک ہے۔ کوئی نہ اس کی گرفت سے نکل سکتا ہے اور نہ اس کے دائرہ اقتدار سے باہر جا سکتا ہے۔ اس یقین کے ساتھ اس یقین کی بھی ضرورت ہے کہ جو کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہماری نگاہوں کو نظر آتا ہے وہ اس کے مقابلے میں بہت کم ہے جو ہم نہیں دیکھتے ہیں۔ اس عالم مادی کے آگے ایک ایسا وسیع عالم ہے جس کے مقابلے میں اس دُنیا کی حیثیت سمندر کے مقابلے میں قطرہ سے بھی کم ہے۔ زندگی کا یہ مختصر دور خدا ترسی اور پرہیزگاری کے ساتھ گزار دیا جائے تو دوسری زندگی میں غیر معمولی راحت و آرام نصیب ہوگا اور ایسی ایسی نعمتیں نصیب ہوں گی کہ:

ما اذنٌ سمعت ولا عینٌ رأت ولا خطر علی قلب بشرٍ (جنھیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا ہے نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گزرا ہے۔

اس یقین کے بعد انسان کی نظر میں دُنیا کی زیب و زینت اور یہاں کے راحت و آرام کی کوئی خاص وقعت باقی نہ رہ جائے گی اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کے بجائے وہ دوسروں کے لیے اپنے منافع سے دست بردار ہو جایا کرے گا اور دوسروں کو آرام پہنچانے کے لیے اپنی راحت کو قربان کر دے گا۔ مطالبے کے بجائے ایثار اس کی عادت ہو جائے گی اور دوسروں کی چیزیں چھیننے کے بجائے اپنی دولت ان کی خدمت میں لگانے کا جذبہ اس کا مطمح نظر بن جائے گا۔ اس طرح باہم کشمکش کے بجائے ایک دوسرے کی اعانت و دست گیری زندگی کا دستور العمل ہو جائے گا اور عداوت و دشمنی کے بجائے محبت و ہمدردی کا ہر جگہ رواج ہوگا۔

عالم غیب چونکہ ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہے اس لیے مادہ

پرست عقل اسے تسلیم کرنے سے گریز کرتی ہے۔ حالانکہ یہی مادہ پرست ہمہ وقت نادیدہ حقائق اور غیر محسوس اشیاء کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے ہیں سائنس کے انکشافات علوم طبعی کے تجربات سب اسی تلاش وجستجو کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ اگر مشاہدات پر انسان اکتفا کر لیتا اور یہ یقین کر لیتا کہ جو کچھ اُسے محسوس ہوتا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تو نہ کسی قسم کی ایجاد ہوتی اور نہ انسانی تمدن ترقی کرتا۔ لیکن چونکہ نادیدہ حقائق پر ایمان اور غیر محسوس اشیاء کے وجود کا یقین انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لیے وہ ہٹ دھرمی سے عالم غیب کا انکار کرتا ہے لیکن عملاً اس کو تسلیم کرتا ہے اور پوشیدہ حقائق کو سمجھنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ روزمرّہ کی زندگی کے ان تجربات کا یہ تقاضا ہے کہ انسان ان کے بھی آگے غیبی امور پر ایمان لے آئے اور سمجھ لے کہ اس عالم مشاہدہ کے ماوراء ایک مستقل عالم ہے جو آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا کہ وہاں کے غیبی حقائق ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں گے اور ہم وہاں کی چیزیں اس دنیا سے بھی زیادہ واضح طریقہ سے دیکھ سکیں گے۔

ایمان بالغیب کے سلسلہ میں ایک یہ نکتہ خاص طور پر ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ یہی ایمان بالرسول کی بنیاد ہے۔ اگر ہم عالم غیب کی جھلک دیکھ کر اس پر ایمان لاتے تو یہ اپنی آنکھوں پر یقین ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ ہوتا کفارِ قریش نے بار بار اس کا مطالبہ کیا کہ اُنھیں براہِ راست عالم غیب کی چیزیں دکھا دی جائیں تاکہ وہ یقین کرلیں کہ جو کہا جا رہا ہے واقعی سچ ہے۔ لیکن ان کے اس مطالبہ کے جواب میں ہمیشہ کہا گیا کہ حاضر کو دیکھ کر غائب کا یقین کرو اور عالم موجود پر نظر ڈال کر عالم غیب پر ایمان لاؤ خود تمہاری زندگی اور اس کے تجربے تمھیں غیبی قوت کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ تم سنجیدگی سے غور کرنے اور سمجھنے کے لیے تیار ہو — تمھاری غفلت دُور کرنے کے لیے تمھیں میں ایک انسان کو مرتبہ رسالت پر سرفراز کیا گیا ہے

اور اُسے عالمِ غیب کا مشاہدہ کرا دیا گیا ہے تاکہ وہ امورِ غیب کے متعلق تمھیں خبر دے سکے۔ تمھارے شکوک و شبہات دور کر کے تمھیں حقیقت کی راہ بتا سکے۔ رسولؐ کی زندگی کا بہت بڑا حصہ تمھارے درمیان گزر چکا ہے۔ تم اس کی ایک ایک بات ایک ایک عادت سے واقف ہو، چالیس برس کا طویل زمانہ ایسی عفت و طہارت، صداقت و امانت اور خلوص و ایمان داری کے ساتھ تمھارے درمیان گزار چکا ہے کہ تمھیں اس کے متعلق ذرا سا بھی شبہ نہیں گزرا۔ اس کی عقل و فہم لیاقت و کارکردگی پر تمھیں اتنا بھروسہ تھا کہ نازک سے نازک موقع پر تم نے اس کے فیصلے کو بے چوں چرا تسلیم کیا۔ اس لیے اب عقل کا تقاضا ہے کہ وہ جو کچھ کہے اُسے مان لو۔ اپنے مشاہدہ اور تجربے کے مقابلے میں اس کے مشاہدہ اور تجربہ پر ایمان لاؤ اور یقین کرلو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ ایسی صاف حقیقت ہے کہ جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔ ایمان بالغیب کی اہمیت کا ذکر اوپر کی سطور میں ہو چکا ہے۔ ایمان جس قدر قوی ہوگا اُسی قدر مومن کی زندگی بامعنی ہوگی۔ اور وہ اس دنیا میں کامیابی حاصل کر سکے گا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بارے میں بہت ممتاز تھے۔ اُنھیں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع پر زیادہ یقین تھا وہ برملا اس کا اعلان کیا کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ ہماری آنکھیں دھوکہ کھا جائیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ غیب کی جو خبریں ملتی ہیں اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ ان کی زندگی میں جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا۔ اُس وقت کیسے پریشان کن حالات تھے۔ آیندہ ہونے والے واقعات کا اندازہ کون نہیں لگا سکتا تھا لیکن غربت و بے بسی اور مظلومی و پریشان حالی کے اس دور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر اُنھیں اتنا یقین تھا کہ صحابۂ کرام کو اس بے چارگی اور

کس مپرسی کے زمانے میں بھی اسلام کے غلبہ و اقتدار اور شکوہ و جبروت کی تصویر مستقبل کے اُفق پر نمایاں نظر آتی تھی۔ یہی یقین تھا جس کے سہارے اُنھوں نے مکہ معظمہ کے شدید تیرہ برس صبر و استقلال کیساتھ گزار دیے اور مدنی زندگی میں گیارہ برس دشمنانِ حق کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور عرب و بیرونِ عرب کی مخالف قوموں نے سر اُٹھایا اور چاہا کہ اسلام کے ننھے سے پودے کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیں تو یہی یقین تھا جس کی بنا پر مخالفت کے اس ہجوم میں ان کے قدم جمے رہے اور اس طوفانِ حوادث سے ان کی کشتیِ امید بچ کر ساحل مراد تک پہنچ گئی۔

اسلام کی گذشتہ تاریخ نظر میں لایئے ڈیڑھ ہزار برس کا وسیع زمانہ اور لاکھوں میل کے طویل و عریض خطوں میں جہاں کہیں عروج و اقبال کی آب و تاب اور شکوہ و عظمت کی چمک دمک نظر آئے گی وہ عالم غیب پر یقین ہی کا جلوہ ہوگا۔ کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کے ہجوم میں وہی مردانِ حق ممتاز نظر آئیں گے جو اپنے مشاہدہ پر نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو ترجیح دیتے ہوں گے اور اپنی آنکھوں سے زیادہ وحی الٰہی پر اعتبار کرتے ہوں گے۔ درحقیقت انھیں بزرگوں کی قوتِ ایمانی نے نازک لمحوں میں راہِ حق دکھائی ہے۔ انھیں کے نورِ بصیرت نے گم کردہ راہوں کو منزلِ مقصود تک پہنچایا اور انھیں کی عقلِ آخر بیں نے مشکلات کار کی گرہ کشائی کی ہے۔ صحابہ کرام اپنی اس قوت ایمانی کی وجہ سے ساری اُمت میں ممتاز ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے ان کے لیے عالمِ غیب کو اس عالمِ شہادت سے بھی زیادہ یقینی بنا دیا تھا، ابعد کے لوگوں کو یہ موقع نصیب نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اندر یقین کی یہ کیفیت پیدا ہونا دشوار ہے۔ لیکن اگر کسی طرح ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا

ہوجائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد والوں کو بھی بڑے مرتبے کا امیدوار بنا دیا ہے، ابوجمعہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس موقع پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح بھی موجود تھے اُنھوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ ہم آپ کے سامنے ایمان لائے اور آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے کیا ہم سے بھی کوئی بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں وہ لوگ ہیں جو تمہارے بعد آئیں گے اور مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے (مسند احمد) ایک دوسری روایت میں اسی کو اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ایک مرتبہ ابوجمعہ بیت المقدس گئے تھے۔ وہاں بہت سے تابعین تشریف رکھتے تھے جب یہ نماز کے بعد واپس ہوئے تو وہ لوگ انھیں رخصت کرنے کے لیے کچھ دُور آئے۔ اس موقع پر ابوجمعہ نے ان لوگوں کے سامنے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اس موقع پر حضرت معاذ بن جبل بھی تشریف رکھتے تھے۔ ہم لوگوں نے حضورؐ سے عرض کیا۔ ہم لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ کی پیروی کی ہم سے زیادہ اجر کا مستحق اور کون ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، تم کو اس سے کیا چیز باز رکھ سکتی تھی اللہ کا رسول تمھارے درمیان موجود ہے، آسمان سے وحی اُتر رہی ہے، جو لوگ تمھارے بعد ہوں گے ان کے پاس کتاب پہنچے گی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور جو کچھ اس میں لکھا ہوگا اس پر عمل کریں گے وہ لوگ تم سے زیادہ اجر والے ہوں گے۔"

(ابن کثیر بحوالہ تفسیر ابن مردویہ)

اس حدیث میں ایک طرف صحابہؓ کرام کو قوت ایمانی میں مزید اضافہ کی رغبت دلائی گئی ہے اور دوسری طرف بعد والوں کی بن دیکھے غیبی حقائق پر یقین رکھنے کی وجہ سے تحسین کی گئی ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اس اُمت کو بارش سے تشبیہہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر۔

ویُقیمون الصّلوٰۃ (اور وہ لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں) ایمان کے بعد مومنین کی عملی صفات کا ذکر کیا اور اس سلسلے میں سب سے پہلے نماز کا ذکر فرمایا، کیونکہ یہ وہ ستون ہے جس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے۔ اس سلسلے میں یہ نہیں فرمایا کہ وہ لوگ نماز پڑھتے ہیں بلکہ فرمایا وہ نماز قائم کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ پابندی کے ساتھ ہمیشہ دل لگا کر پورے آداب کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ اسلام میں نماز کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ ایمان سے جو کیفیات قلب میں پیدا ہوتی ہیں۔ نماز کے ذریعہ اُن میں تازگی اور استحکام پیدا ہوتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس مومن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کی جاتی ہے صبح سے بستر سے اُٹھتے ہی روزمرہ کے کاروبار میں داخل ہونے سے پہلے خدا کے حضور میں حاضری دی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی آیات خصوصاً سورۃ فاتحہ کی تلاوت رکوع و سجود کی تسبیحوں اور نماز کے اندر دوسرے اوراد اور دعاؤں میں ایسے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے انسان کو عبدیت کا صحیح مقام نظر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا غیر معمولی تعلق پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد زندگی کی کشاکش میں وہ صراط مستقیم کو کبھی بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ پھر کام کاج میں لگ جاتا ہے۔ دوپہر کو دم لے کر مشاغل حیات کا سلسلہ پھر شروع کرنے سے پہلے ظہر کی نماز ادا کرتا ہے۔ سابق زندگی میں جو غلطیاں ہو چکی ہیں اُن سے توبہ کر کے نئے سرے سے پاک اور صالح زندگی گزارنے کا عہد کرتا ہے۔ اس طرح کاروبار کے شدید انہماک کے وقت عصر انھیں جذبات کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اس کے بعد مغرب پڑھتا ہے پھر سونے سے پہلے عشا کے وقت خدا کے سامنے کھڑا ہو کر پچھلی خطاؤں پر معافی کی درخواست کرتا ہے اور صالح زندگی گزارنے کا از سرِ نو عہد کرتا ہے۔ اس کے بعد خدا کا نام لے کر سو جاتا ہے۔ اس توجہ اور ان جذبات کے ساتھ نماز ادا کرنے والا گناہوں کی آلائشوں میں مبتلا نہیں رہ سکتا اس لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ

نے فرمایا ہے کہ

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر — نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو گناہوں کا کفارہ قرار دیا ہے اور نمازی کو اس شخص سے تشبیہہ دی ہے جو دن میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو۔ جس طرح اس شخص کے بدن پر میل باقی نہیں رہ سکتا اسی طرح نماز پڑھنے والے پر گناہوں کی آلائش نہیں رہ سکتی۔ بشرطیکہ نماز خیال کر کے اور سمجھ کر پڑھی جائے۔ ذاتی طہارت کے علاوہ نماز سے انسان کے اندر وہ طاقت پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے انتھک جد وجہد کرتا ہے اور تادم آخر نیکیوں کے پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے میں منہمک رہتا ہے۔

ومما رزقنٰھم ینفقون — اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

نماز حق اللہ ہے اس سے ایمان میں حضور و دوام پیدا ہوتا ہے، زکواۃ انسانوں کا حق ہے جو اس ایمان کا مقتضے ہے۔ اس آیت میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ انسانوں کے پاس جو کچھ ہے وہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، اسی کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو اسی کی بخشی ہوئی قوتوں سے لوگ حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری خودی و انانیت ختم ہو جائے اور ہم اس دنیا میں اپنے کو کسی چیز کا اصلی مالک نہ سمجھیں بلکہ یہ خیال کریں کہ یہ سب چیزیں اللہ ہی کی ہیں ——— اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں ہمارے سپرد کر دی ہیں۔ ہماری حیثیت مالک کی نہیں ہے بلکہ ہم ان اشیاء کے امین ہیں ہمارا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان چیزوں کو صرف کریں اور ہمارے پاس جو کچھ ہے اُسے اُس کے بندوں کی خدمت اور اُس کے دین کی تقویت میں خرچ کریں۔

والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک — اور اس پر جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کی ایک ایسی صفت بیان کی گئی ہے جو دنیا کی اور کسی قوم میں نہیں پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنی ہی کتاب اور اپنی ہی شریعت پر ایمان نہیں لاتے بلکہ یہ لوگ تمام انبیاء علیہم السلام کو مانتے ہیں ان کی شریعت کو آسمانی شریعت سمجھتے ہیں اور ان کی کتاب کو اللہ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ اس بارے میں اس درجہ شدت ہے کہ اگر کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے کسی بھی نبی کی نبوت میں شک کرے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا ہے اس صفت نے مسلمان کو ایسی مرکزی حیثیت دے دی ہے جو کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے۔ اس عالم کا نظام انھیں ہاتھوں میں صحیح رہ سکتا ہے جو شرک کے بجائے توحید اور افتراق کی جگہ اتحاد کے داعی ہوں جو اللہ کے تمام نیک بندوں کا احترام کرتے ہوں سچائی اور نیکی کے قدرداں ہوں اور اس عالم میں اپنی خواہش کی حکومت نہ چاہتے ہوں بلکہ مرضی الٰہی کے مطابق ایک ایسا پاک اور صالح نظام قائم کرنا چاہتے ہوں جس میں نہ ذاتی مفاد کا لحاظ ہو نہ خود غرضی کا دخل ہو بلکہ بے لوث خدمت اور نوعِ انسانی کو دائمی راحت و اطمینان سے ہمکنار کرنے کی آرزو ہو۔

وبالاخرۃ ھم یوقنون — اور آخرت پر وہ لوگ یقین رکھتے ہیں

جن پرہیزگار اور خدا ترس انسانوں کو قرآن مجید سے راہ ہدایت نصیب ہوتی ہے اور وہ منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں ان کی متعدد صفات اس سے پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ جن میں سرفہرست ایمان بالغیب کو جگہ دی گئی ہے اور آخر میں ایمان بالآخرۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ آغاز و انجام دونوں پہلوؤں کے متعلق ان کی امتیازی وصف کو نمایاں کیا جائے۔ ایک طرف ان کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اس دنیا کے ظاہری حالات اور مشاہدات پر نظر نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ

یقین رکھتے ہیں کہ اس کارگاہِ عالم کے پیچھے ایک بالاتر ہستی کا دستِ قدرت کام کر رہا ہے جو کچھ ہو گیا یا ہو رہا ہے وہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک علیم و بصیر ذات کی مشیت کا ظہور ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کا سفر مرنے کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد اصل منزل سامنے آتی ہے ہماری یہ حیاتِ ناپائیدار درحقیقت زندگانیِ جاوید کا پیش خیمہ ہے اور یہ جہانِ فانی اس عالمِ باقی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔

آخرت کا یقین زندگی کو بامعنی بنا دیتا ہے انسان کو بقا و دوام کی آرزو اور ارتقاء دائم کی تمنا ہے وہ زوال اور فنا کو سخت ناپسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہمیشہ باقی رہے، برابر ترقی کرتا رہے اور اس کی کوئی خواہش ایسی نہ ہو جو پوری نہ ہو سکے۔ لیکن اس دنیا کی محدود گنجایش میں نہ اس کی تمناؤں کے حسبِ دل خواہ پورا ہونے کا امکان ہے نہ ہر لمحے بدلتے رہنے والے عالم میں اسے کسی طرح ثبات حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب تک وہ یہاں زندہ رہتا ہے۔ برابر کرب و بے چینی محسوس کرتا رہتا ہے اور جب یہاں سے رخصت ہوتا ہے تو حسرت و افسوس کرتا ہوا دم توڑتا ہے۔ لیکن ایک مومن صالح اس دنیا میں بھی سکون کی زندگی گزارتا ہے اور مرتے وقت بھی اطمینان سے جان دیتا ہے آئندہ زندگی پر یقین اور جزائے اعمال پر ایمان کی وجہ سے جلوت و خلوت ہر جگہ وہ برائیوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور نیکی سے اپنے نامۂ اعمال کو سنوارنے کی فکر کرتا ہے۔ آخرت پر یقین کیے بغیر نہ افراد کی زندگی سدھر سکتی ہے نہ جماعتوں کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ قانون زیادہ سے زیادہ ظاہر میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ لیکن باطن کی صفائی اور نیت کی پاکیزگی ایک علیم و بصیر ذات کی نگرانی پر یقین اور جزائے اعمال پر اعتقاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، تاریخ کے اوراق اس دعوے کے شاہد ہیں یہی عقیدہ تھا جو خلوت کے مجرموں کو خود حکام کے سامنے آکر اقبالِ جرم پر آمادہ کرتا تھا اور سنگین سے سنگین سزا خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی

ہمت پیدا کرتا تھا۔ چور اپنا ہاتھ کٹانے پر اصرار کرتے تھے اور بدکار سنگسار کر دیے جانے کی خواہش کرتے تھے۔ تاریخ و حدیث کی کتابیں اس عورت کے ایمان بالآخرۃ کو بھول نہیں سکتیں جس سے بدکاری کا سنگین جرم سرزد ہو گیا تھا۔ خلوت میں جو کچھ ہوا اس کا حال کسی کو معلوم نہیں تھا وہ سزا سے محفوظ رہ سکتی تھی لیکن اس کے ایمان نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ زندگی میں اس جرم کی سزا بھگت لے تاکہ آخرت کے عذاب سے محفوظ رہے اسے معلوم تھا کہ اس گناہ کی سزا میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور وہ بھی کس سختی سے۔ تلوار سے سر قلم کرانا آسان پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لینا بھی اتنا دشوار نہ تھا۔ لیکن ایک میدان میں کھڑے ہو کر ہزاروں پتھروں کی ضرب کھا کر جان دینا بہت ہی مشکل ہے اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے سنگسار کیا جائے گا اور لگاتار پتھروں کی مار سے اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گا۔ لیکن آخرت کے عذاب کی ہیبت اس کے دل پر ایسی طاری تھی کہ اس کے مقابلے میں اُسے یہ سب مصیبتیں گوارا تھیں وہ دوڑی ہوئی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ مجھے پاک کر دیجیے۔ حضرتؐ نے منہ پھیر لیا وہ دوسری طرف جا کر یہی گذارش کرنے لگی آپؐ نے پھر توجہ نہیں کی لیکن جب اس کے بعد بھی اس کا اصرار جاری رہا تو آپؐ نے فرمایا کہ ابھی تمھارے پیٹ میں بچہ ہے وضع حمل کے بعد آنا۔ لیکن مہینوں کا یہ وقفہ بھی اس کے ارادہ میں کوئی ضعف پیدا نہ کر سکا وضع حمل کے بعد وہ پھر حاضر خدمت ہوئی اور سنگسار کر دیے جانے کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا ابھی بچہ شیرخوار ہے جب اس کا دودھ چھوٹ جائے۔ دو سال کی مدت خاصی طویل ہوتی ہے۔ اس کے لیے پورا موقع تھا کہ وہ اپنے ارادہ سے باز آ جاتی۔ لیکن اس کے دل میں آخرت کا یقین اس درجہ قوی تھا کہ یہ لمبی مدت بھی اس کے عزم میں فتور نہ پیدا کر سکی۔ جب دو برس پورے ہوئے اور بچہ نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو پھر حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ حضورؐ اب مجھے پاک کر دیجیے اب کوئی چارہ کار نہ تھا آخر حضورؐ نے اُسے سنگسار کرا دیا۔

یہ تو خیر ایک صحابیہ عورت کا تذکرہ تھا جس کے دل میں حضورؐ کی نگاہ ایمان آفریں نے یہ قوت ایمانی پیدا کر دی تھی لیکن ہماری تاریخ میں ہزاروں مثالیں ان اشخاص کی بھی ملیں گی جو بظاہر دنیا دار سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آخرت کا یقین انھیں لرزا دیتا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی کا واقعہ ایمان بالآخرۃ کی کتنی واضح مثال ہے۔ ایک مرتبہ اس کے سپاہیوں نے کسی بڑھیا کی گائے پکڑ لی تھی۔ سپاہیوں سے مقابلہ اس غریب کے امکان سے باہر تھا۔ ایک دن سلطان کی سواری ایک پل سے گزرنے والی تھی جب ملک شاہ کی سواری پل کے پاس پہنچی تو وہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا۔ کہ بتا میرا انصاف اس پل پر ہو گا یا اس پل پر۔" ملک شاہ گھبرا کر سواری سے اتر پڑا اور کہنے لگا "اس پل پر کھڑے ہونے کی تاب کسے ہے۔ اسی پل پر تمھارا انصاف کیا جائے گا۔ بڑھیا نے سارا واقعہ بیان کیا۔ سلطان نے فوراً سپاہیوں کو بلا کر سخت سزا دی اور بڑھیا کا مطالبہ پورا کیا

اولٰئِکَ علیٰ ھُدًی مِّن رَّبِّھِمْ وَاولٰئِکَ ھُمُ المُفْلِحُوْن — ایسے ہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

رکوع کے آغاز میں ذکر ہو چکا ہے کہ یہ کتاب (قرآن مجید) خدا ترس اور پرہیز گار بندوں کے لیے ہدایت ہے۔ پھر ان کے اوصاف بیان کیے گئے اور آخر میں فرمایا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں انھیں ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت حاصل ہے اور وہ فلاح یابی کے پورے طور سے مستحق ہیں اس موقع پر اولٰئِکَ کو دو مرتبہ لا کر خاص طور سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ ہدایت یابی اور کامگاری کے لیے مذکورہ بالا صفات ضروری ہیں۔ جن اصحاب میں یہ صفات پائی جائیں گی اُن کے لیے کامیابی قطعی ہے۔ اس موقع پر ہدایت سے پہلے علیٰ اور اسکے بعد رب کے لفظ سے پھر اولٰئِکَ کی تکرار، ھُمْ کے اضافہ اور مُفْلِحُوْن کے شروع میں ال کے لانے سے

معانی میں ایسا غیر معمولی زور پیدا ہوگیا ہے جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عربی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جو لوگ عربی زبان کے الفاظ اس کے اسالیب بیان سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔ اُن کے لیے اس عبارت کے زور و قوت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ سادہ طریقے سے بس یہی کہا جا سکتا ہے۔ الھدیٰ کے بجائے ھدیً لاکر ہدایت میں بڑی وسعت جامعیت اور عظمت پیدا ہوگئی ہے۔ پھر اس کے بعد من ربھم لانے سے اس میں اور بھی معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ ربوبیت کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی گئی ہے اور ہدایت کا تعلق رب سے کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انھیں ایسی ہدایت حاصل ہوگی جو اس ذات کے شایانِ شان ہے جو اُن کا رب ہے ان کی پرورش جب غیر معمولی توجہ سے کی جاتی ہے تو اُن کی ہدایت کا بھی اسی طرح غیر معمولی اہتمام ہے۔

ھُدیً سے پہلے علےٰ لانے سے یہ غرض ہے کہ ان لوگوں کو اس ہدایت پر پورا قابو حاصل ہوگا۔ وہ جس طرح چاہیں گے اس سے مستفید ہوں گے۔ اس قسم کی ہدایت حاصل ہو جانے کے بعد جو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوگی ظاہر ہے اسی لیے اس موقع پر اولٰئِکَ کی تکرار کی گئی ہے پھر ھُمْ کا اضافہ کیا گیا پھر مُفْلِحُوْن کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تاکہ متقی انسانوں کی کامیابی میں ذرہ برابر بھی شبہ باقی نہ رہ جائے اور معلوم ہو جائے کہ درحقیقت ان صفات کے حامل اصحاب ہی فلاح و کامگاری کے مستحق ہیں۔

حدیث نبوی کے اوّلین صحیفے

گذشتہ ساٹھ ستر برس میں مخالفین اسلام نے اسلام کی بیخ کنی کی جو تدبیریں کی ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ خطرناک ان کا وہ پروپیگنڈا ہے جو اُنھوں نے احادیث نبوی کے خلاف کیا ہے۔ اُنھوں نے حدیث کے پورے ذخیرے کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لیے یہ افسانہ گڑھا کہ ڈھائی سو برس تک حدیثیں صرف زبانی بیان ہوتی رہیں۔ لکھنے کا سلسلہ تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ذیل کا مضمون اس غلط بیانی کی تردید میں لکھا گیا ہے اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ حفظ کے ساتھ حدیثوں کو قید تحریر میں لانے کا رواج شروع سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک ہی سے حدیثیں لکھی جانے لگی تھیں اور صحابۂ کرام نے ایک عظیم الشان ذخیرہ کتابی شکل میں تیار کر دیا تھا۔

حدیث کی ضرورت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے۔ جب کوئی شخص زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) کہتا ہے تو اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے اللہ کو اپنا مالک و آقا اور اس کے رسول کو اپنا ہادی و رہنما تسلیم کر لیا ہے اور اپنے آپ کو بالکل ان کے حوالہ کر دیا ہے اسی سپردگی کا نام

اسلام ہے۔ مسلم وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سر اطاعت جھکا دے اور اپنی جان و مال، اولاد و املاک خواہشات و جذبات سب ان کے سپرد کرے اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ	بلاشبہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جان و مال جنّت کے بدلے خرید لیے ہیں۔

اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے بجائے ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کا متلاشی رہے اور جب اُن کا حکم معلوم ہو جائے تو ایک فرمانبردار اور سعادت مند غلام کی طرح بے چوں و چرا تعمیل حکم کرے۔ کیونکہ اس نے لاالٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کہہ کر یہی اقرار کیا ہے اور اسلام قبول کرکے اپنی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلایا ہے۔

جب ہر مسلمان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرنا لازمی تھا تو پھر ضرورت تھی کہ یہ ہدایات صحت و جامعیت کے ساتھ مرتب ہو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کر دیا اور فرمان و احکام کا یہ ذخیرہ پوری صحت و جامعیت کے ساتھ اس طرح محفوظ ہو گیا کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کا مجموعہ قرآن مجید کہلاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حدیث کے نام سے موسوم ہیں۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کے حفظ و ضبط اور تحریر و ترویج کے ساتھ احادیث کی نشر و اشاعت اور حفاظت و صیانت کی جانب خاص توجہ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح آج سیکڑوں برس گزرنے کے بعد قرآن مجید ہر قسم کے تغیر و تبدل اور تحریف و تبدیل سے پاک ہے۔ اسی طرح غیر معمولی صحت وصداقت کے ساتھ ہزاروں حدیثیں اوراق و صحف میں محفوظ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آخری دینِ کامل، شریعت اور

دائمی نمونۂ عمل کے لیے ہی حفاظت کی ضرورت تھی تاکہ قیامت تک کسی شک و شبہ کی گنجایش نہ ہو اور خدا کا آخری دین ہمیشہ نوعِ انسانی کے لیے نمونۂ عمل رہے۔

آنحضرتؐ کی توجہ

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ احادیث کی جانب بھی شروع ہی سے توجہ رہی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا خاص خیال تھا۔ صحابۂ کرام کو قرآن مجید کی آیتیں سُناتے ان کے معنی و مطالب سے آگاہ فرماتے اور اسلامی احکام کی تشریح کرتے، اجمال کی تفصیل کرتے، ابہام کی وضاحت فرماتے اور پیچیدہ سوالات کے جواب دیتے۔ صحابہ کرام آپؐ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو یاد رکھتے، خود بھی اس پر عمل کرتے اور دوسروں تک بھی لے پہنچاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی: بلغوا عنی ولو ایۃ، فلیبلغ الشاھد منکم الغائب[1]، ونضر اللہ امرأ سمع مناحدیثا فحفظہ وبلغہ غیرہ الخ[2] صحابۂ کرام نے اس پر پورا عمل کیا ارشاداتِ نبوی کو سُنتے اور انھیں یاد کرنے کا اس درجہ اہتمام کرتے کہ بہت سے اصحاب نے دنیا کے سارے علائق کو چھوڑ رکھا تھا اور شبانہ روز اسی میں وقت گزارتے تھے۔ اصحاب صفہ کا پورا گروہ اسی قسم کا تھا یہ لوگ گھر بار کی فکروں اور بال بچوں کی ذمہ داریوں میں مبتلا نہ تھے۔ ان کا یہی کام تھا کہ جہاں تک ہو سکے آنحضرت سے استفادہ کریں۔ ان بزرگوں کے علاوہ جن لوگوں کو روزمرہ کی خانگی ضرورتوں کی بنا پر اس کا موقع نہ تھا۔ وہ آپس میں باری مقرر کر لیتے تھے اور ہر شخص اپنی باری کے واقعات اپنے ساتھی کو سُناتا تھا۔

---

[1] بخاری کتاب العلم باب لیبلغ العلم الشاہد الغائب

[2] بخاری کتاب العلم باب التناوب فی العلم

اسلام کے ابتدائی ایام میں یہی طریقہ رہا کہ لوگ حدیثیں زبانی یاد کرتے اور اسی طرح دوسروں کو پہنچاتے۔ اس دور میں قرآن مجید کے سوا ہر چیز کے لکھنے کی ممانعت تھی مقصود یہ تھا کہ کلامِ الٰہی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہے اور آیاتِ الٰہی کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ ہونے پائے۔

کتابت حدیث کی اجازت

لیکن جب اسلام لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گیا۔ قرآن مجید کا کافی حصہ نازل ہو چکا اور اس کا کوئی خوف نہ رہا کہ حدیث کے الفاظ قرآن مجید میں مل جائیں گے اور تحریف کا امکان پیدا ہو جائے گا تو پھر کتابت حدیث کی اجازت دیدی گئی۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کی مشہور روایت ہے۔

کنت اکتب کل شئ اسمعہ من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فنھتنی قریش وقالوا تکتب کل شئ تسمعہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتکلم فی الرضاء والغضب فامسکت عن الکتاب فذکرت ذلک لرسول اللہ صلعم فاومی باصبعہ الی فیہ قال اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا الحق

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کے ارادہ سے لکھ لیا کرتا تھا قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سُنتے ہو سب لکھ لیتے ہو۔ حالانکہ آپ خوشی میں باتیں کرتے ہیں کبھی غصّے کی حالت میں۔ یہ سُنکر میں نے لکھنا چھوڑ دیا پھر آنحضرت سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ نے اپنے دہنِ مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا لکھو، خدا کی قسم اس سے حق ہی نکلتا ہے۔

عہد رسالت کی تحریری کوشش

غرض کہ اس طرح عہدِ رسالت

ہی میں سینوں کی امانت سفینوں میں منتقل ہونے لگی اور احادیث کا اچھا خاصہ حصہ کتابی شکل میں مرتب ہوگیا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابنِ عاص کا اوپر ذکر آچکا ہے ان کا حال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اس طرح انھوں نے ایک اچھی خاصی کتاب تیار کرلی۔ اس کتاب کا نام انھوں نے صادقہ رکھا تھا یہ صحیفہ انھیں بہت عزیز تھا وہ فرمایا کرتے تھے

مابن غبنی فی الحیاۃ الا خصلتان الصادقہ والوھط [1]	مجھے زندگی کی خواہش صرف دو چیزیں صادقہ اور وہط [2] دلاتی ہیں۔

صادقہ کا یہ نسخہ عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا ان کے پوتے عمر ابنِ شعیب کے پاس لوگوں نے اسے دیکھا اور ذکر کیا [3]

حضرت علیؓ نے بھی آنحضرت سے سن کر کچھ روایتیں لکھ لی تھیں جو ان کے پاس کتابی شکل میں تھیں [4]

حضرت انس نے بھی کچھ حدیثیں قلمبند کی تھیں یہ مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ان کے پاس موجود رہا۔ چنانچہ جب لوگ زیادہ ہو جاتے تو وہ اسے نکال کر انھیں دکھاتے [5]

یہ تو چند خاص اصحاب کی تحریری کوششوں کا ذکر تھا۔ لیکن کتابت و تحریر کا کام صرف اسی حد تک محدود نہ تھا بلکہ آنحضرت کی مجلسِ مبارک کا عام دستور تھا۔ دارمی کی مشہور روایت ہے۔

عن ابی قبیل قال سمعت عبداللہ قال بینما نحن حول رسول اللہ	ابو قبیل کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ ہم رسول

---

[1] جامع صد ۳۷ [2] ایک زمین کا نام ہے۔ [3] تہذیب جلد ۸ صد ۴۹
[4] بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم [5] تقیید العلم صد ۵

نکتب اذ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای المدینتین تفتح اولا قسطنطینیۃ او رومیۃ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل مدینۃ ھرقل

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد لکھ رہے تھے کہ اتنے میں آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ دونوں شہروں میں سے پہلے کون سا فتح ہوگا قسطنطنیہ یا رومیہ؟ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ ہرقل کا شہر

حضرت ابوہریرہ کا بھی ایک اسی قسم کا بیان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں حدیثوں کی روایت کے قلم بند کرنے کا عام رواج تھا[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے املا

صحابۂ کرام کی ان تحریری کوششوں کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض ضروری احکام و ہدایات لکھا دیا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے سال میں خزاعہ کے کچھ لوگوں نے بنی لیث کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے سواری پر سوار ہو کر ایک خطبہ دیا۔ جس میں مکہ معظمہ کی عظمت و حرمت کا ذکر فرمایا۔ اور لوگوں کو قتل و خونریزی سے باز رہنے کی ہدایت کی۔ ایک یمنی صحابی (ابوشاہ) نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ یہ خطبہ مجھے لکھ دیجیے آنحضرتؐ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور یہ خطبہ کل لکھوا دیا[۱]

حضرت معاذ بن جبل جب یمن کے گورنر مقرر کیے گئے تھے تو روانگی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں اسلامی مسائل کے متعلق ضروری ہدایات دیں اور نظائر و اشباہ پر قیاس اور استنباط مسائل کی تعلیم فرمائی۔ لیکن بایں ہمہ یمن میں اُنھیں بہت سی باتیں دریافت طلب محسوس ہوئیں۔ چنانچہ اُنھوں نے

---

[۱] دارمی صہ ۶۰ [۲] خطبات مدارس بحوالہ مسند احمد بن حنبل جلد ۳

[۳] بخاری جلد اول کتاب العلم باب کتابۃ العلم

اس کے متعلق آنحضرت صلعم سے لکھ کر دریافت کیا جس کے جواب میں آپ نے اُنھیں ایک تحریر بھیجی دارقطنی[۱] نے اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔

اسی طرح عبداللہ بن الحکیم ایک دوسرے صاحب تھے اُنھیں مردہ جانوروں کے متعلق ایک تحریر لکھی تھی[۲]

وائل ابن حجر مشہور صحابی ہیں جب آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوکر اور اپنے وطن حضرموت واپس جانے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز روزہ شراب سود کے مسائل لکھ کر ان کے حوالے کیے۔ حضرت عمرو ابن حزم کو جب یمن کا حاکم بناکر روانہ کیا تو اُنہیں فرائض صدقات ودیات کے متعلق ایک تحریر لکھ کر حوالے کی[۳] بعض امرا کو زکوٰۃ کے احکام بہت تفصیل سے لکھ کر بھیجے یہ تحریر حضرت ابوبکرؓ بن عمرو ابن حزم اور اُن کے خاندان کے لوگوں کے پاس عرصے تک محفوظ رہی چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانے میں یہ تحریر اُن کے خاندان کے یہاں برآمد ہوئی[۴]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ حدیثیں لکھی ہوئی رکھی تھیں آپ کی وفات کے بعد آپ کی تلوار کی میان میں وہ صحیفۂ روایات پایا گیا[۵]۔ یہ تو چند تحریروں اور مشہور حدیثوں کے مجموعوں کا ذکر تھا اس کے علاوہ مختصر طور پر صحابہ کرامؓ کو خاص ہدایات خطوط کے جوابات مدینہ منورہ کی مردم شماری کے کاغذات قبائل کے نام، ہدایت نامے امرا وولاۃ کے نام احکام سلاطین و اقوام عالم کے نام اسلام کے دعوت نامے، صلحنامے معاہدے، امان نامے سینکڑوں ہزاروں چیزیں تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور خود آپ کی رہنمائی میں تحریری شکل میں مرتب ہوگئی تھیں

---

[۱] دارقطنی ص۴۸ [۲] خطبات مدارس بحوالہ طبرانی صغیر ص۲۱۷ [۳] خطبات بحوالہ کنز العمال جلد۳ ص۱۶۴ [۴] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ اور دارقطنی ص۴۸۵ جلد۲ [۵] جامع بیان العلم ص۳۲

اور مختلف صحابیوں کے پاس محفوظ تھیں۔

عہدِ صحابہؓ کی تحریری جدوجہد

عہدِ صحابہ میں ان تحریری کوششوں میں اور اضافہ ہوا۔ جن بزرگوں نے عہدِ رسالت میں اپنی روایتیں کتابی شکل میں مرتب نہیں کی تھیں۔ اب اُنھوں نے بھی اس جانب توجہ کی حافظے کتابت کی شکل اختیار کرنے لگے اور سینوں کی امانت سفینوں میں منتقل ہونے لگی۔ خلافتِ راشدہ کے ابتدائی عہد میں کچھ دن ارتداد کے ہنگاموں نے اس کا موقع نہ دیا۔ لیکن جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو قرآن مجید کے ساتھ حدیث کی جمع و ترتیب کی جانب بھی توجہ ہوئی۔ بعض صحابہ کو شروع میں تامل رہا جس کی وجہ ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی ابتدائی ارشاد تھا کہ

لاتکتبوا عنی شیئاً سوی القرآن فمن کتب عنی شیئاً سوی القرآن فلیمحہ

مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو جس شخص نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہو اُسے چاہیے کہ اُسے مٹا دے۔

جن صحابہ کو اس کا نسخ نہیں پہنچا تھا وہ پرانے حکم کی بناپر کتابت حدیث کے قائل نہ تھے۔ بعض بزرگوں کو خیال تھا کہ اس طرح حفظ و ضبط کی طرف توجہ نہ رہے گی اور سفینوں کا علم سینوں کو خالی کر دے گا۔ آئندہ صرف تحریریں رہ جائیں گی جن کے پس پشت حافظ کی قوت نہ ہو گی کہ غلطیوں کی تصحیح ہو سکے اور حذف و اضافہ کا پتا چل سکے اور اس طرح خطرہ تھا کہ تحریف کے دروازے کھل جائیں گے اور منافقین

---

۵۷ اس موضوع پر خطباتِ مدراس کا تاریخی خطبہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ مولانا نے اس میں اس قسم کے بہت سے جزوی واقعات جمع کر دیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط اور معاہدے تحریری شکل میں اس وقت بھی موجود ہیں اور رسالاتِ نبویہ کے نام سے بازار میں ملتے ہیں

۵۸ جامع بیان العلم ص ۳۲

یہود اور دوسرے مخالفین کو روایات میں تغیر و تبدل، حذف و اضافہ اور زیادتی کو نقصان کا موقع مل جائے گا اور دین کی بنیادوں میں رخنہ اندازی کی راہیں کھل جائیں گی۔ ان وجوہ کی بنا پر کچھ دن تک لوگوں کو تذبذب رہا۔ لیکن جب اسلام کی قوت میں اضافہ ہوا اور اس جانب سے اطمینان ہو گیا تو قرآن مجید کی طرح رفتہ رفتہ حدیثیں بھی کتابی شکل اختیار کرنے لگیں۔ لیکن حفظ و ضبط پر اب بھی زور دیا جاتا تھا اور حافظہ کے بغیر کتابیں دیکھ دیکھ کر روایتیں بیان کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں تحریری مجموعوں کو کوئی غیر معمولی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم اب اس کی ضرورت عام طور سے محسوس کی جانے لگی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صحابۂ کرام کتابت حدیث کی ضرورت و اہمیت پر متفق ہو چکے تھے حضرت عروہ کا بیان ہے۔

ان عمر ابن الخطاب اراد ان یکتب السنن فاستفتی اصحاب رسول اللہ صلعم فی ذلک فاشاروا علیہ ان یکتب[۱]	حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ حدیثیں لکھ لی جائیں صحابہ سے مشورہ کیا انھوں نے لکھنے کی رائے دی۔

حضرت عمرؓ کا خود بھی یہی خیال ہو رہا تھا کہ احادیث و سنن کتابی شکل میں جمع کر دی جائیں لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ فسخ کر دیا کہ کہیں اس کی وجہ سے قرآن مجید کی جانب سے بے توجہی نہ ہو جائے لیکن بعد کو یہ شبہ جاتا رہا اور اس کی ضرورت بالکل واضح ہو گئی تو حکم دیدیا قیدوا العلم بالکتاب[۱] علم کو احاطہ تحریر میں لے آؤ۔

صحابہ کرام کے مرتب کئے ہوئے حدیث کے مجموعے

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی پانچسو حدیثوں کا ایک مجموعہ اپنی زندگی میں مرتب کیا تھا جو حضرت

عائشہ کے پاس رکھا ہوا تھا۔ انتقال کے وقت خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مجموعے میں میں نے اپنے اطمینان پر کچھ ایسی روایتیں لکھ لی ہوں جو صحیح نہ ہوں اس لیے اسے ضائع کر دیا۔ تاہم چونکہ یہ مجموعہ عرصے تک حضرت عائشہؓ کے پاس رہا اور ان کا شوق حدیث اور علم و فضل مشہور و معروف ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سارا مجموعہ ان کے حافظہ میں محفوظ ہو گیا ہوگا جو بعد کو ان کے شاگردوں کے ذریعہ کتابی شکل میں آگیا ہوگا۔ کتابت حدیث کا رجحان برابر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں کافی تحریری سرمایہ کتابی شکل میں جمع ہو گیا تھا۔[۳]

اب روز بروز جمع و ترتیب حدیث کے متعلق شکوک و شبہات ختم ہوتے جاتے تھے اور جو صحابہ پہلے اسے ناپسند فرماتے تھے وہ بھی اپنی رائے تبدیل کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس جو پہلے کتابت حدیث کے سخت مخالف تھے اور لوگوں کو اس سے روکتے تھے اب اس کے قائل ہی نہیں بلکہ اس پر عامل ہو چکے تھے۔[۴]

حضرت عبداللہ ابن مسعود جو کبھی تحریری روایات کے اتنے مخالف تھے کہ لکھے ہوئے حروف کو پانی سے دھلوا دیتے اور روایتوں کے مجموعوں کو نذر آتش کر دیا کرتے تھے[۱] اب وہ خود اور ان کے شاگرد حدیثوں کے لکھنے لکھانے میں مشغول تھے۔[۲]

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی تصنیفات

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا اب یہ حال تھا کہ ان کے شاگرد حدیث کی نشر و اشاعت میں پوری

---

[۱] دارمی ص ۶۸ [۲] تذکرۃ الحفاظ ذکر حضرت ابو بکرؓ

[۳] جامع ص ۳۲ [۴] ترمذی کتاب العلل

توجہ سے مصروف تھے ان کے شاگرد اُن کے پاس بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے۔

حضرت سعید ابن جبیر کا بیان ہے کہ

کنت اکتب عند ابن عباس فی صحیفۃ	میں عبداللہ ابن عباس رضؓ کے پاس کتاب میں لکھتا تھا۔

اور جب کاغذ پر گنجایش باقی نہ رہتی تو چمڑے پر لکھتے۔ حالتِ سفر میں کجاوے کی لکڑی سے یہ کام لیا جاتا۔ غرض کہ سفر و حضر ہر جگہ حدیثیں لکھی جا رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے پاس متعدد صحیفے جمع ہو گئے تھے جب اُن کا انتقال ہوا تو انھوں نے کتابوں کا اتنا ذخیرہ چھوڑا تھا جو کہ ایک اونٹ کا بوجھ تھا۔

موسیٰ ابن عقبہ کا بیان ہے

وضع عند ناکریب حمل بعیر اوعدل بعیر من کتب ابن عباس قال فکان علی ابن عبد اللہ اذا اراد الکتاب کتب الیہ ابعث علی صحیفۃ کذا قال فیکتبھا فیبعث الیہ احداھما	کریب نے ہمارے پاس ایک اونٹ کے برابر حضرت عبداللہ ابن عباس کی کتابیں رکھیں۔ علی ابن عبداللہ ابن عباس جب کوئی کتاب چاہتے تو اُنھیں لکھ دیتے کہ مجھے فلاں صحیفہ بھیج دو۔ وہ اسے نقل کرتے اور ان میں سے ایک بھیج دیتے۔

ان کی یہ تصانیف اُن کی زندگی ہی میں دُور دُور تک پھیل گئی تھیں اُس سلسلہ میں امام طحاوی نے خود اُن کا بیان نقل کیا ہے۔

عن ابن عباس ان ناسا من اھل الطائف اتوہ بصحف من صحفہ لیقرء ھا علیھم فلما اخذ ھالم ینطلق فقال انی لما ذھب بصری بلھت	عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ طائف کے کچھ لوگ ان کے پاس ان کی کتابوں میں سے کچھ کتابیں لے کر آئے تاکہ وہ اُنھیں پڑھ کر سنا دیں۔ عبداللہ ابن عباس نے وہ کتابیں لے لیں۔ جب پڑھ نہ سکے تو فرمایا جب

فاتروا ھا علیٰ ولا یکن فی انفسکم من ذلک حرج فان قرءتکم علی کقرءتی علیکم۔

سے میری نگاہ جاتی رہی میں بیکار ہو گیا ہوں تم لوگ خود میرے سامنے پڑھو اس میں کوئی حرج نہ سمجھو میرے سامنے تمہارا پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ میں تمہارے سامنے پڑھوں۔

تصنیفات کی اس کثرت کو دیکھ کر تعجب نہ ہو حضرت عبداللہ ابن عباس رض نے آنحضرت کے اعمال و اقوال کے جمع کرنے میں غیر معمولی محنت کی تھی خود اُن کا بیان ہے کہ

لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا شاب قلت لشاب من الانصار یا فلان ھلم نسأل اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نتعلم منھم فانھم کثیر قال العجب لک یا ابن عباس اتری الناس یحتاجون الیک وفی الارض من تری من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فترکت ذلک واقبلت علی المسئلة وتتبع اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فانی کنت لآتی الرجل فی الحدیث یبلغنی انہ سمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجدہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو میں نوجوان تھا میں نے ایک انصاری نوجوان سے کہا کہ اے صاحب آیئے ہم لوگ صحابہ رض سے مسائل دریافت کریں اور ان سے سیکھیں۔ کیونکہ وہ بہت کافی تعداد میں موجود ہیں اس شخص نے جواب دیا اے ابن عباس تم پر سخت تعجب آتا ہے دیکھ رہے ہو دنیا میں آنحضرت کے کیسے کیسے صحابی موجود ہیں کیا لوگ تمہاری ضرورت محسوس کریں گے یہ سن کر میں نے اُسے چھوڑ دیا اور خود صحابہ رض کی تلاش و جستجو میں نکل کھڑا ہوا اور ان سے مسائل دریافت کرنے لگا میری حالت یہ تھی کہ مجھے معلوم ہوتا کہ فلاں صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سُنی ہے میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر وہ آرام کرتے ہوتے تو میں ان کے دروازے پر چادر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہوا کے جھونکے میرے چہرے پر لگتے رہتے

قائلا فاتوسد ردائی علی بابه تسفی الریح علی وجہی حتی یخرج فاذا خرج قال یا ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالک فاقول حدیث بلغنی عنک تحدثہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحببت ان اسمعہ قال فیقول فھلا بعثت الی حتے اٰتیک فاقول انا احق ان اٰتیک فکان الرجل بعد ذلک یرانی وقد ذھب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واحتاج الناس الیّ فیقول کنت اعقل منی

یہاں تک کہ وہ برآمد ہو جاتے تو مجھ سے دریافت کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر عم زاد خیر تو ہے۔ میں عرض کرتا مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں میں نے چاہا کہ میں اسے سنوں۔ وہ فرماتے مجھے کیوں نہیں بلا بھیجا میں خود آپ کے پاس آجاتا میں جواب دیتا نہیں میں آپ کے پاس آنے کا زیادہ مستحق ہوں۔ اب اس وقت جب کہ صحابہؓ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور لوگ میرے محتاج ہیں وہ انصاری نوجوان کہتا ہے آپ مجھ سے زیادہ عقلمند تھے۔[۱]

حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعب کے ساتھ انھیں خاص اختصاص و تقرب حاصل تھا۔ اس لیے اُن کی روایات بھی عبداللہ بن عباس کے علم میں تھیں[۲]

حضرت ابوہریرہؓ کی کتابیں

روایاتِ حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ

---

[۱] جامع ص۱۷۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ ذکر حضرت عبداللہؓ بن عباس

کو خاص امتیاز حاصل ہے آج حدیث کی کتابوں میں ان کی بکثرت روایتیں موجود ہیں جن کی تعداد ۵۳۷۴ تک پہنچتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے حدیثوں کے حفظ و ضبط اور جمع و ترتیب میں غیر معمولی محنت و جانفشانی سے کام لیا۔ اسلام کے بعد عرصے تک زن و فرزند کے جھمیلے سے الگ اور فکرِ معاش سے بے پروا ہو کر مسجد نبوی کے چبوترے (صفہ) پر شبانہ روز حاضر رہتے۔ آنحضرتؐ کی ایک ایک بات سنتے۔ ایک ایک عمل کو دیکھتے اور اُسے یاد کرتے خود اُن کا بیان ہے کہ

ان اصحابی من المھاجرین کانت تشغلھم صفقاتھم بالسوق و اصحابی من الانصار کانت تشغلھم ارضوھم والقیام علیھا وانی کنت امرءً مسکینا وکنت اکثر مجالسۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احضر اذا غابوا واحفظ اذا نسوا وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثنا یوما فقال من یبسط ثوبہ حتے افرغ فیہ من حدیثی ثم یقبضہ الیہ فلا ینسیٰ شیئا سمعہ منی ابدا فبسطت ثوبی او قال نمرتی فحدثنی

میرے مہاجر ساتھیوں کو بازار کی خرید فروخت مشغول رکھتی تھی اور انصار کھیتی باڑی کے کام میں مصروف رہتے تھے میں ایک مسکین آدمی تھا اکثر خدمت نبوی میں حاضر رہتا جب وہ غائب ہوتے تھے تو میں حاضر ہوتا تھا جب وہ بھول جاتے تھے تو میں یاد کرتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے حدیث بیان کی پھر فرمایا کون اپنا کپڑا پھیلاتا ہے کہ میں —— اس میں اپنی حدیث ڈال دوں پھر وہ اسے سمیٹ لے اس کے بعد وہ جو کچھ مجھ سے سنے گا کبھی فراموش نہ ہوگا میں نے اپنا کپڑا پھیلا دیا آنحضرت نے حدیث بیان فرمائی پھر میں نے اُسے سمیٹ لیا۔ خدا کی قسم اس کے بعد میں نے جو کچھ —— سُنا کبھی فراموش نہ ہوا۔

ثم قبضته الی فواللہ ماکنت
نسیت شئیا سمعتہ منہ[۱]

انھوں نے رات کے تین حصے کر دیے تھے ایک میں سوتے، ایک میں عبادت کرتے اور ایک حصہ میں حدیثیں یاد کرتے۔ اس طرح احادیث کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ ہو گیا تھا۔ بعد کو اُن کی زندگی ہی میں یہ روایات کتابی شکل میں جمع ہو گئی تھیں اور دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ اس سلسلے میں چند نسخے اب تک مشہور ہیں۔

ایک نسخہ بشیر ابن نھیک نے مرتب کیا تھا اُن کا بیان ہے کہ

کنت اکتب ما اسمع من ابی ھریرۃ[۲] — میں ابو ہریرہؓ سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا۔

دوسرا مجموعہ حسن ابن عمرو ابن امیۃ الضمری کے پاس تھا[۳]

تیسرا مشہور مجموعہ ہمام ابن منبہ کے پاس تھا۔ یہ صحیفہ عرصہ تک موجود رہا امام احمد نے اپنی مسند کی تیسری جلد میں صفحہ ۳۱۲ سے ۳۱۸ تک اس سے نقل کیا ہے[۴] بعد کو اصل صحیفہ کا پتا نہیں چلتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خیال ہو گیا تھا کہ وہ کہیں ضائع ہو گیا[۵] لیکن اب پتا چلا ہے کہ وہ برلن کے کتب خانہ میں موجود ہے[۶] ان مختلف مجموعوں کے علاوہ جو ان کے شاگردوں نے مرتب کیے تھے

---

[۱] طبقات ابن سعد القسم الثانی سن الجزء الرابع صہ ۵۶ بخاری کتاب العلم باب حفظ العلم میں بھی یہی بات کسی قدر اختصار کے ساتھ موجود ہے۔

[۲] دارمی صہ ۶۸ [۳] جامع صہ ۸۴

[۴] مسند احمد ابن حنبل صہ ۳۱۸-۳۱۲ [۵] تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی حاشیہ صہ ۹۹ کئی برس ہوئے [۶] ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے شائع کر دیا۔

خود حضرت ابوہریرہؓ نے بھی ایک مجموعہ مرتب کر کے اپنے پاس رکھا تھا۔ اور کبھی کبھی لوگوں کو دکھاتے تھے[۱]

حضرت ابن عمرؓ کی روایات کی کتابت

مکثرین صحابہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر کا دوسرا درجہ ہے۔ محدث ابن جوزی نے ان کی موجودہ روایتوں کی تعداد ۲۶۳۰ بتائی ہے۔ شروع میں یہ بھی کتابت حدیث کو پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن بعد کو جب اس کی ضرورت محسوس کی تو لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے ممتاز شاگرد نافع ان کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے[۲] مجاہد اور سعید ابن جبیر بھی ان کی روایتیں لکھا کرتے تھے اور پوچھ پوچھ کر ان کی تصحیح کرتے تھے[۳] ان کے بیٹے سالم بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے[۴] اس کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن عمر خود بھی لکھاتے تھے[۵] حضرت انسؓ جن کی آج ۲۲۸۶ روایتیں حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ ان کی اپنی اولاد کو عام تاکید تھی قیدوا العلم بالکتاب[۶] ان کے شاگرد ابان ان کے پاس بیٹھ کر تختی پر لکھا کرتے تھے[۷]

حضرت جابرؓ کے صحیفے

حضرت جابرؓ ابن عبداللہ کی مرویات سے

---

[۱] خطبات مدراس بحوالہ فتح الباری جلد ۱ صـ۱۸۴

[۲] دارمی صـ۶۶ [۳] جامع صـ۲۳ [۴] دارمی صـ۶۶

[۵] خطبات بحوالہ مسند احمد حنبل جلد ۱ صـ۱۹۹

[۶] دارمی صـ۶۸ [۷] دارمی صـ۶۸

[۸] تلقیح فہوم اہل الاثر ابن جوزی بحوالہ دارالندوہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

[۹] طحاوی جلد ۲ صـ۳۸۴

احادیث کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ جن کی تعداد ۱۵۴۰ ہے۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ

کنا نأتی جابر ابن عبد اللہ فنسالہ عن سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنکتبھا	ہم حضرت جابر ابن عبد اللہ رضؓ کے پاس آیا کرتے تھے۔ اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ پھر اُنہیں لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ روایتیں خود ان کی زندگی میں متعدد نسخوں میں جمع ہوگئی تھیں ان میں سے تین صحیفوں کا ذکر رجال کی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک مجموعہ اسمٰعیل ابن عبدالکریم کے پاس تھا[۱] دوسرا سلیمان لشکری کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ ایک مجموعہ خود ان کے پاس بھی تھا۔ ابوبکر ابن عیاش سے اعمش نے اس زمانے کے لوگوں کی رائے نقل کی ہے۔

ان مجاھدا[۲] یحدث عن صحیفۃ جابر	حضرت مجاہد حضرت جابر کے صحیفہ سے حدیث بیان کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضؓ کے تحریری مجموعے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جلالت شان اور ان کا مرتبہ علم وفضل کسی سے پوشیدہ نہیں فقہاء صحابہ رضؓ تک مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے قبیصہ ابن ذویب کا بیان ہے کہ

کانت عائشۃ اعلم الناس یسألھا اکابر الصحابۃ	حضرت عائشہ رضؓ سب لوگوں سے زیادہ عالم تھیں اُن سے بڑے بڑے صحابہ رضؓ دریافت کرتے تھے۔

---

[۱] تہذیب جلد ۲ صـ۳۰۶ [۲] تہذیب جلد ۲ صـ۲۱۱ [۳] طبقات جلد ۵ صـ۳۴۴

تذکرۃ الحفاظ جلد اول صـ۲۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو قرب و اختصاص حاصل تھا وہ سب کو معلوم ہے حدیث کی کتابوں کے صفحات ان کی مرویات سے پُر ہیں۔ محدث ابن جوزی نے ان کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ بتائی ہے یہ روایتیں حضرت عُروہ اور حضرت عمرہ کے ذریعہ اسی زمانے میں کتابی شکل میں مرتب ہو گئی تھیں۔

حضرت عُروہ حضرت عائشہؓ کے ہمشیر زادے تھے۔ اس رشتے سے ان کی خدمت میں اکثر حاضری کا موقع ملتا تھا۔ اُنھیں علم کا ذوق اور احادیث و سنن کی تلاش و جستجو کا بے حد شوق تھا کرید کرید کر حدیثیں پوچھتے مسائل کی تحقیق کرتے اور لوگوں میں ان کی اشاعت کرتے۔ ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ امام زہری جیسے عالم کا بیان ہے کہ میں نے اُنھیں ایسے سمندر کی طرح پایا جو کبھی خشک نہیں ہوتا[۱]

حضرت عروہ کتابت حدیث کے قائل تھے خود بھی لکھتے تھے اور اپنے بیٹے ہشام کو بھی لکھاتے تھے۔ ان کے پاس خود ان کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں بھی موجود تھیں جو واقعہ حرہ تک موجود رہیں۔

حضرت عمرہ کی روایتیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ان کے بھانجے ابوبکر ابن محمد نے قلمبند کیں۔ قاضی مدینہ سعد بن ابراہیم کو حکم تھا کہ وہ بھی حدیثیں جمع کریں چنانچہ اُنھوں نے دفتر کے دفتر لکھے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے تمام اسلامی ممالک میں شائع کیے گئے۔ حضرت عائشہ کی مرویات ایک اور ذریعہ سے بھی قلمبند ہوئیں۔ ابو قلابہ ایک مشہور تابعی ہیں جو حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں یہ کتابتِ حدیث کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ انتقال کے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۵۴ [۲] جامع ص ۳۷ [۳] جامع ص ۳۶

[۴] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۸۲

بعد ان کی کتابیں ایک جانور کے بوجھ کے برابر ابوایوب سختیانی کو ملیں حضرت عائشہؓ خود بھی کتابت حدیث کی قائل تھیں۔ بعض روایات اُنھوں نے اپنے قلم سے بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے استفسار پر ایک مرتبہ اُنھیں حدیث لکھ کر بھیجی تھی۔

حضرت ابوسعید خذری کی روایت

مکثرین صحابہ میں حضرت ابوسعید خذری کا بھی شمار ہوتا ہے مرویات کی تعداد ۱۱۷۰ ہے۔ یہ کتابت حدیث ناپسند کرتے تھے۔ شاگرد آپ کی مرویات قلمبند کرنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے اس کی اجازت چاہی۔ لیکن حضرت ابوسعید خذری نے اسے منظور نہیں کیا۔ البتہ یہ کہا کہ انھیں اچھی طرح یاد کرلو۔ تاہم یہ روایتیں ان کے شاگردوں میں حضرت نافع کے ذریعہ احاطہ تحریر میں آگئیں۔ حضرت نافع کتابت حدیث کے قائل تھے۔ اور ان کی روایتیں اُن کے سامنے لکھی جاتی تھیں عطاء ابن ابی رباح ان کے ایک نامور شاگرد ہیں۔ اُن کا یہ حال تھا کہ ان کی روایتیں پوچھ پوچھ کر لکھی جاتی تھیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت جابر اور مجاہد بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور ان لوگوں کا مسلک کتابت حدیث کے بارے میں اوپر کے صفحات میں گزر چکا ہے اس طرح یہ بیقین کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوسعید خذری کی تمام مرویات عہد صحابہ ہی میں تحریری شکل میں جمع ہوگئی تھیں

مکثرین صحابہ کی تصانیف

صفحات بالا میں حضرت ابوھریرہؓ

۱؎ البدایۃ والنہایۃ ذکر حضرت عثمان غنیؓ ۲؎ دارمی ص ۱۹

۳؎ تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۴؎ تہذیب

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت انس بن مالکؓ حضرت عائشہؓ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت جابرؓ ابن عبداللہ اور حضرت ابوسعیدؓ خدری سات کثیر الروایات صحابیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان لوگوں کی مرویات کی تعداد (۵۳۷۴ + ۲۶۳۰ + ۲۲۸۶ + ۲۲۱۰ + ۱۶۶۰ + ۱۵۴۰ + ۱۱۷۰) ۱۷۸۷۰ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن عاصؓ کی مرویات کی تعداد حضرت ابوہریرہؓ سے زیادہ ہے۔ جس کا حضرت ابوہریرہؓ کو خود اعتراف ہے۔ لہٰذا جب حضرت ابوہریرہؓ کی روایتیں ۵۳۷۴ ہیں تو حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کی روایت کردہ حدیثیں کسی طرح چھ ہزار سے کم نہ ہوں گی۔ اس طرح صرف آٹھ صحابہ کی لکھی ہوئی روائیتوں کی تعداد کم از کم (۱۷۸۷۰ + ۶۰۰۰) ۲۳۸۷۰ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس تعداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لکھی ہوئی پانچسو حدیثوں کا اضافہ کیا جائے یہ تعداد ۲۴ ہزار سے تجاوز کر جاتی ہے۔

اس موقع پر اگر یہ پیش نظر رہے کہ صحیح بخاری کی دو ضخیم جلدوں میں جو بڑے سائز کے ۱۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہیں صرف ۹۰۸۲ حدیثیں درج ہیں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان ۲۴ ہزار سے متجاوز روائیتوں کے لیے کتنی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوگی اس سلسلے میں اگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام بخاری کا قاعدہ ہے مختلف مسائل کے ثبوت اور استدلال کی غرض سے ایک ہی حدیث کو متعدد موقعوں پر نقل کرتے ہیں تو اندازہ اور بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ ان مکرر حدیثوں کی تعداد اتنی زائد ہے کہ ۹۰۸۲ میں سے حقیقتہً صرف ۲۶۰۲ روایتیں ہیں۔ جو بار بار کی تکرار سے ۹۰۸۲ ہوگئی ہیں۔

اب صحیح بخاری کی روایتوں کی اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مذکورہ بالا صرف آٹھ کثیر الروایات صحابہ کی بیان کردہ حدیثیں کم از کم بخاری جیسی بیسؔ جلدوں میں آئیں گی جن کی صفحات کی تعداد بائیس ہزار سے متجاوز ہوگی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی تصنیفات

اب آیئے ذرا اور آگے بڑھیے صحابۂ کرامؓ میں ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب ایسے تھے جو حدیثیں خود بھی لکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی لکھاتے تھے۔ ان صاحبوں میں حضرت عبداللہ ابن مسعود خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُنھیں تعلقِ خاص تھا۔ آغازِ اسلام سے آپ کے ساتھ زندگی لبسر کی۔ خدمت مبارک میں اس قدر آنا جانا ہوتا تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کوئی آنحضرت کے گھر کے آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ اور خلفاء راشدین کی نظر میں ان کی بڑی اہمیت تھی لوگ انھیں آنحضرت سے بہت مشابہ سمجھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں اُن کا یہ مرتبہ تھا کہ جب اُنھیں تعلیم وارشاد کے لیے کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ میں عبداللہ ابن مسعود کو تمھارے پاس بھیج کر اپنے اوپر تمھیں ترجیح دے رہا ہوں [۲]

حضرت عبداللہ شروع میں کچھ دن تک کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے اتنے مخالف تھے کہ لکھی ہوئی کتابوں کے حروف پانی سے دھلوا دیتے تھے اور روایتوں کے مجموعوں کو نذرِ آتش کر دیا کرتے تھے۔ لیکن جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس جانب ایسی توجہ کی کہ خود بھی حدیثیں کتابی شکل میں مرتب کیں اور اپنے شاگردوں کو بھی لکھائیں۔ ان کے شاگرد ان کی روائتیں لکھ لیا کرتے تھے۔[۵] ان کے مشہور شاگرد علقمہ کاغذ پر لکھی ہوئی غذ یثیں

---

[۱] حضرت عبداللہ بن مسعود کے یہ مناقب تاریخی تذکروں کے علاوہ بخاری اور صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔

[۲] جامع بیان العلم ص ۳۳ [۳] دارمی ص ۶۵

[۴] جامع ص ۲۰ [۵] دارمی

زبانی یاد کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایتیں یہی نہیں کہ صرف چند آدمی ان کے سامنے بیٹھ کر لکھتے ہوں بلکہ بہت سے ایسے بھی لوگ تھے جو ان کے پاس سے حدیثیں سن کر گھروں میں جا کر لکھتے تھے۔ یہ طریقہ خاص طور سے لوگوں نے اس زمانے میں اختیار کیا تھا۔ جب حضرت عبداللہ حدیثوں کو قید تحریر میں لانے کے مخالف تھے۔ اس ترکیب سے ان کی ابتدائی زمانہ کی مرویات بھی کتابی شکل میں مرتب ہو گئی تھیں۔ تلامذہ اور عقیدت مندوں کی ان کوششوں کے علاوہ خود حضرت عبداللہ نے بھی کافی حدیثیں جمع کی تھیں جو ایک کتاب کے برابر ہو گئی تھیں۔ انتقال کے بعد یہ مجموعہ ان کے گھر سے برآمد ہوا اور ان کے بیٹے عبدالرحمن نے قسمیں کھا کھا کر لوگوں سے کہا کہ یہ کتاب خود حضرت عبداللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔[1]

حضرت ابن مسعود کی روایات علماء کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اول تو انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ بابرکت میں حاضری کا کافی شرف حاصل رہا ہے اس کے علاوہ احادیث کی روایت میں الفاظ کی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے ان تمام خوبیوں کے ساتھ فہم و بصیرت اور علم و تفقہ میں بہت ممتاز تھے اور اہم فقہاء میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت زید ابن ثابت کی مرویات

صحابہ میں زید ابن ثابت بھی

---

[1] جامع صـ۳۷

[2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۱۲

[3] ایضاً تذکرہ صـ۱۲

بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اُنھیں اتنا تقرب حاصل تھا کہ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے آپؐ کے حسب ارشاد عبرانی زبان سیکھی تھی اور اُس میں آپ کی ترجمانی کرتے تھے۔ صحابہؓ کی نظر میں بھی ان کی بہت اہمیت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں جمع قرآن کی خدمت اُنھیں کے سپرد کی تھی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے جب عہد صدیقیؓ کے مرتب شدہ مصحف کی نقل دیار و امصار میں بھجوائی تو نقل و کتابت کا کام انھیں زید ابن ثابت کے سپرد کیا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کے جیسے کثیر العلم صحابی اُنھیں راسخین فی العلم میں شمار کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ جو اپنی کثرتِ روایات اور ذوق علم میں مشہور ہیں وہ بھی ابن زید کی وسعت علم کے قائل ہیں۔ چنانچہ جب ان کی وفات ہوئی تو فرمایا کہ اس امت کا غیر معمولی عالم وفات پاگیا۔[1]

ان خصوصیات کی بنا پر لوگوں کو خیال تھا کہ کسی طرح حضرت زیدؓ کی روایات بھی کتابی شکل میں مرتب ہو جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کتابتِ حدیث کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ نے ان کی بیان کردہ حدیثیں قلمبند کرائیں۔ لیکن جب اُنھیں معلوم ہوا تو مٹا دیں۔[2] بالآخر مروان نے خاص ترکیب سے ان کی روایتیں قلمبند کرائیں۔ اس نے ایک پردہ ڈلوا دیا اور اس کے پیچھے ایک آدمی کو بٹھا دیا۔ پھر حضرت زید کو بلا کر ان سے حدیثیں دریافت کرنے لگا وہ حدیثیں بیان کرتے اور پس پردہ مقرر شدہ آدمی اُنھیں لکھتا جاتا۔ مروان کے علاوہ حضرت زید کے ایک اور نامور شاگرد جناب عروہ بن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۶

[2] تذکرہ جلد اول ص ۲۷

[3] جامع بیان العلم ص ۲۳

زبیرؓ بھی ہیں۔ انھیں اور ان کے صاحبزادے ہشام کو کتابت حدیث کا جس قدر خیال اور اس جانب توجہ تھی اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

دوسرے اہم صحابہ کی کتابیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت ابو رافع کی روایتیں حضرت عبداللہ ابن عباس نے جمع کر لی تھیں[۲]

حضرت سمرہ ابن جندب ایک اور مشہور صحابی ہیں۔ ان کی روایتیں بھی ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئی تھیں۔ یہ مجموعہ عرصے تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا ان کے پوتے حبیب نے اس سے دیکھ کر روایتیں کیں[۳]

حضرت رافع ابن خدیج کے پاس آنحضرت کے اقوال تحریری شکل میں موجود تھے[۴]

حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے بھی بعض حدیثیں قلمبند کیں۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد کیا پڑھا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں انھوں نے وہ دعا لکھ کر بھیجی[۵]

حضرت براء ابن عازب ایک اور نامور صحابی ہیں۔ ان کی روایتیں ان کی زندگی ہی میں تحریری شکل میں مرتب ہو گئی تھیں ان کے شاگردوں کے شوق کتابت کا یہ حال تھا کہ کاغذ نہ ہوتا تو ہتھیلیوں ہی پر لکھتے[۶] جنھیں پھر صاف

---

[۱] دارمی ص ۶۶ [۲] خطبات مدارس بحوالہ طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم ۲ ص ۱۲۳

[۳] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۹۸

[۴] مسند احمد ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۴۱

[۵] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یقول الرجل اذا سلم

[۶] دارمی ص ۶۶

کر لیتے۔ حضرت سعد ابن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے۔ انھوں نے بھی حدیثیں کتابی شکل میں جمع کی تھیں۔ جوان کے بیٹے کے پاس بعد کو بھی موجود رہیں اور جنہیں انھوں نے اپنے شاگردوں تک پہنچایا۔

حضرت عبداللہ ابن ابی ادنی ایک خاص صحابی ہیں۔ انھوں نے بھی حدیثیں لکھی تھیں۔ ان کے شاگردوں نے ان کی تحریری روایتیں بعد کے لوگوں سے بیان کیں۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت کے سلسلے میں ایک صاحب سالم ابوالنضر کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن ابی ادفی نے لکھا جسے میں نے پڑھا۔[۴]

حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہ کی اہمیت محتاج تشریح نہیں آپ کو بھی جمع و تحریر احادیث سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو نصیحت کرتے تھے کہ

تعلموا العلم فانکم ان تکونوا صغار قوم تکونوا کبار هم غدا فمن لم یحفظ فلیکتب	علم حاصل کرو کیوں کہ اگر آج تم قوم میں چھوٹے ہو تو کل ان کے بڑے ہو گے جو یاد نہ کر سکے اسے چاہیے کہ لکھ لے۔

حضرت معاویہ رض حضرت ثوبان اور حضرت ابوامامہ کی مرویات ان کے شاگرد خالد ابن معدان کے ذریعہ تحریری شکل میں مرتب ہوئیں۔ انھوں نے ستر صحابہ سے ملاقات کی تھی تحریر و تدوین کی جانب اتنی توجہ تھی کہ ان کے پاس ایک خاصی باقاعدہ کتاب مرتب ہو گئی تھی۔

---

[۱] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یقول الرجل اذا سلم

[۲] دارمی ص۶۶

[۳] ترمذی جلد اول باب القضاء بالیمین مع الشاہد

[۴] بخاری جلد اول کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال

مکثرین صحابہ کی تقریباً پچیس ہزار روایتوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے جو ان کے سامنے ہی تحریر کا قالب اختیار کر چکی تھیں۔ سطور بالا میں چند اور مشہور صحابہ کے تحریری مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو یقیناً ہزارہا حدیثوں پر مشتمل تھے لیکن یہ تعداد یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں خطوط کو بھی شامل کرنا چاہیئے جو انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمال، فوجی افسروں اور معلمین او محصلین کے نام لکھے اور ان افسروں اور عالموں کی جانب سے جو احکام و فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں جاری کیے گئے تو تحریری روایات کا یہ ذخیرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحریری معاہدے خطوط اور فرامین حدیث و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ متعدد اہل علم نے انھیں علاحدہ کتابی شکل میں بھی مرتب کر دیا ہے۔ الرسالت النبویہ کا ذکر اوپر کہیں ہو چکا ہے۔ چند برس ہوئے جمہرۃ رسائل العرب کے نام سے مصر سے ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کئی سو صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے خطوط اور فرامین درج ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کا مرتب کردہ یہ سارا تحریری سرمایہ ان کے شاگردوں (تابعین) کے ذریعہ آئندہ نسل (تبع تابعین) تک پہنچا۔ ان کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا مذاق عام ہو چکا تھا۔ یہ حدیثیں باضابطہ کتابی شکل میں مرتب ہوئیں۔ شروع میں ایک ایک صحابیؓ کی روایات علاحدہ علاحدہ مرتب ہوئیں اور ان کو کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا۔ ان کتابوں کو مسند کہتے ہیں ان میں اسم وار ہر صحابی کی روایتیں ایک ساتھ درج ہوتی ہیں ــــ ان مسانید سے مسائل کا نکالنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ اس لیے اشخاص کے بجائے عنوان و روایات

سلہ

سلہ جامع بیان العلم صنہ

سلہ تذکرہ صدا جلد اول و تہذیب جلد ۳ ص ۱۱۹

مرتب کی گئیں۔ یہ مجموعے جامع اور سنن کے نام سے موسوم ہیں۔ پہلے مختلف شہروں اور استادوں کی روایات کے مختصر مجموعے مرتب ہوئے آگے چل کر ان مختصر کتابوں کو یکجا کیا گیا اور مسند و سنن اور جامع کے نام سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں تیار ہوگئیں۔ مسند ابوداؤد طیالسی مسند احمد بن حنبل، سنن ابی داؤد سجستانی، سنن ابن ماجہ، سنن نسائی جامع ترمذی بخاری و مسلم۔

مذکورہ بالا کتابوں میں حدیث کا بکھرا ہوا تحریری سرمایہ جمع کر دیا گیا یہ کتابیں حدیث کی اہم اور بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ انھیں پر شریعت کی بنیاد ہے اور استخراج و استنباط مسائل میں عموماً انھیں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ جو روایتیں ان مصنفین نے کسی وجہ سے چھوڑ دیں حاکم، دار قطنی بیہقی وغیرہ بعد کے مصنفوں نے ان کو بھی اپنی کتابوں میں جمع کر دیا تاکہ اول درجہ کی صحیح حدیثوں کے ساتھ دوم اور سوم درجہ کی کمزور روایتیں بھی محفوظ ہو جائیں اور مجتہدین کے سامنے اجتہاد و استنباط مسائل کے وقت ہر قسم کی صحیح و سقیم روایتوں کا پورا ذخیرہ رہے تاکہ وہ پورے ماحول کا اندازہ کرسکیں اور ان کی روشنی میں فیصلہ کرسکیں۔

ان روایات کو سمجھنے، ان کے مراتب کا اندازہ کرنے اور ان سے کام لینے کے لیے اصول مرتب کیے گئے۔ اور روایتوں کی صحت و ضعف کے تصفیہ کے لیے راویوں کے حالات بھی بیان کیے گئے اور اسماء الرجال کا پورا فن مدون ہوگیا۔

مندرجہ بالا سطور میں مختصر طور پر حدیث کی تاریخ بیان کی گئی ہے اسے پڑھ کر آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ حدیث کی حفاظت کے لیے کتنی محنت کی گئی ہے اور کیسا عظیم الشان اور مستند ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

○

استقامت

ایک مرتبہ ایک صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

قُل آمنتُ باللہِ ثُمَّ استقم — اللہ تعالیٰ پر ایمان کا اقرار کرو پھر اس پر جم جاؤ

دوسرے موقع پر اسی پہلو کی جانب اس طرح توجہ دلائی کہ ایمان کی لذت شناسی کی علامت یہ ہے کہ مسلمان

یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ — کفر کی طرف لوٹنا اسا ہی ناپسند کرتا ہو جیسا

ان یُقذَفَ فی النار — آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور ایمان و استقامت کے متعلق قرآن مجید کی ہدایات نے مسلمانوں کی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا اور نازک سے نازک حالات میں بھی وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔ کفارِ قریش نے اُنھیں ستانے اور تکلیف دینے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ پتھروں سے مارا کانٹوں میں گھسیٹا اور انگاروں پر لٹایا۔ لیکن کسی ایک مسلمان کے ایمان میں ذرہ برابر کمی نہیں کرسکے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کی خلافت کے زمانے میں حضرت حبیب ابن زید انصاری مسیلمہ کذّاب کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے۔ اُس نے پوچھا کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبی سمجھتے ہو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہاں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول سمجھتا ہوں۔ مسیلمہ کذاب نے پھر سوال کیا میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے کیا تم میرے نبی ہونے کی شہادت دیتے ہو اُنھوں نے فرمایا میں

نہیں سنتا ہوں۔ اس بات سے مسلمہ بن کذاب بہت غضبناک ہوا اور انھیں سخت تکلیف پہنچانے لگا۔ مورخ کا بیان ہے کہ ظالم ان کا ایک ایک عضو کاٹتا تھا اور پوچھتا تھا کہ اب کیا رائے ہے۔ کیا تم میری نبوت تسلیم کرتے ہو وہ پوری بے خوفی کے ساتھ کہتے تھے۔ نہیں، اس کے بعد ان کا دوسرا عضو کاٹتا تھا۔ پھر پوچھتا تھا بتاؤ اب کیا کہتے ہو کیا اب بھی میری نبوت سے انکار ہے. وہ فرماتے ہاں اب بھی میں تمھیں جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یہ سن کر وہ حکم دیتا کہ تیسرا عضو کاٹا جائے۔ اس کے بعد پھر سوال کرتا کہ اب کیا رائے ہے۔ وہ پھر اس کی نبوت تسلیم کرنے سے انکار کرتے۔ اس طرح ایک ایک کر کے ظالم نے ان کے تمام عضو کاٹے۔ لیکن اتنی سخت تکلیف کے بعد بھی اُن کے یقین میں کوئی ضعف نہیں آیا اور وہ مرتے دم تک ایمان پر قائم رہے (ابن کثیر)

اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی صبر و استقامت کی غیر معمولی مثال ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ وہ رومیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے تو لوگ انہیں پکڑ کر اپنے بادشاہ کی خدمت میں لے گئے۔ اس نے انھیں عیسائیت کی جانب ترغیب دی اور کہا کہ اگر تم عیسائی مذہب اختیار کر لو تو صرف یہی نہیں کہ تمھیں رہائی حاصل ہو جائے گی بلکہ تمھارے ساتھ غیر معمولی عنایت و مہربانی کا سلوک ہوگا۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو میں تمھیں اپنی حکومت میں شریک کر لوں گا اور اپنی لڑکی سے تمھارا نکاح کر دوں گا۔ ایک قیدی کے لیے جس کی جان خطرہ میں ہو یہ کتنی بڑی ترغیب تھی۔ لیکن اللہ کے بندوں پر بھلا ایسی باتیں کیا اثر کر سکتی ہیں۔ اُنھوں نے بڑی لاپرواہی کے ساتھ کہا۔ اتنی ہی پیش کش کا کیا ذکر ہے اگر روم و عرب کی ساری مملکت ہی مجھے عطا کر دی جائے اور مجھ سے خواہش کی جائے کہ میں پل بھر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین سے پھر جاؤں تو یہ ناممکن ہے۔ یہ پر زور جواب سن کر وہ سخت غضبناک ہوا اور اس نے جھلا کر کہا

اگر تم میری دعوت قبول نہیں کروگے اور اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کروگے تو میں تمھیں قتل کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ ابن حذرفہ نے فرمایا۔ جو تیرا جی چاہے کر میں اپنے ایمان سے نہیں پھر سکتا۔ یہ سن کر وہ اور غصہ ہوا اور حکم دیا کہ انھیں پھانسی دے دی جائے۔ اس حکم کے مطابق فوراً سولی لگا دی گئی ان کے گلے میں پھندا ڈال دیا گیا اور تختے پر کھڑے کر دیے گئے۔ اس کے بعد بادشاہ نے تیراندازوں کو حکم دیا کہ ان کے جسم کو تیروں کا نشانہ بنائیں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق ان کے ——— ہاتھوں اور سر پر تیر پڑنے لگے۔ ہر تیر پر بادشاہ کہتا تھا کہ اب بھی خیر ہے اگر نصرانیت قبول کر لو تو اس عذاب سے چھٹکارا پا سکتے ہو۔ لیکن اللہ کے بندوں کی نظر تو آخرت پر ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اصلی زندگی تو خدا کے یہاں کی زندگی ہے۔ دنیا کی زندگی کا کیا؟ اسے تو کسی نہ کسی دن ختم ہونا ہی ہے۔ اس حیاتِ فانی کے لیے حیات جاودانی کو خراب کرنا سخت نادانی ہے۔ جس قدر تکلیف پہنچتی تھی اُن کا جوش ایمان اور بڑھتا تھا۔ جب قیصر روم نے دیکھا کہ یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو اُس نے ایک سخت تکلیف دہ عذاب کا نمونہ دکھا کر مرغوب کرنا چاہا۔ حکم دیا کہ انھیں سولی پر سے اُتار لیا جائے۔ اس کے بعد اپنے آدمیوں سے کہا کہ ایک بڑی دیگ آگ پر چڑھا دو۔ اُنھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب دیگ خوب گرم ہو کر انگارہ کی طرح سُرخ ہو گئی تو ایک مسلمان قیدی کو اس میں ڈلوا دیا۔ چند منٹ میں وہ بے چارہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہ ہولناک اور ہوشربا منظر دکھا کر بادشاہ نے حضرت عبداللہ ابن حذرفہ سے پھر مطالبہ کیا کہ اب بھی خیر ہے عیسائیت قبول کر لو۔ ورنہ تمھارا بھی یہی حشر ہوگا۔ لیکن اُن کے پائے استقامت کو اب بھی جنبش نہ ہوئی اور بغیر کسی خوف اور جھجک کے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اب بادشاہ کے غصّے کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے حکم دیا کہ انھیں اُٹھا کر دیگ میں جھونک دیا جائے، جلاد فوراً آگے بڑھے اور پکڑ کر دیگ میں پھینکنے لگے۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ ابن حذرفہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور زار و قطار رونے لگے۔

رومی بادشاہ سمجھا کہ عذاب کی دہشت نے اُنھیں گھبرا دیا ہے اور اُسے توقع ہوئی کہ اب وہ ضرور عیسائی ہو جائیں گے۔ یہ خیال کر کے اُس نے حکم دیا کہ اُنھیں چھوڑ دیا جائے اس کے بعد اس نے بلا کر پھر گفتگو شروع کی۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ اب بھی اپنی رائے پر قائم ہیں۔ آپ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ میں موت کے ڈر سے رو رہا ہوں زندگی کے خاتمے پر کیا رونا اس نے تو ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔ میں تو اپنی اس بے مائگی پر رو رہا ہوں کہ آج اللہ کی راہ میں نثار کرنے کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی جان ہے جو ایک ہی بار اس دیگ میں جھونکی جا سکتی ہے۔ میری تو آرزو ہے کہ لے کاش بدن کے ایک ایک بال کی جگہ میں بے شمار جانیں رکھتا تو اس موقع پر اللہ کی راہ میں سختیاں جھیلنے کا لطف اُٹھاتا۔ اب قیصر روم نے اُنھیں جیل بھیج دیا اور طرح طرح کی سختیاں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کا کھانا پینا بھی بند کر دیا گیا جب کئی دن بے آب و دانہ گزر گئے تو بادشاہ نے ان کے کھانے کے لیے سور کا گوشت اور پینے کے لیے شراب بھیجی۔ حالت بہت نازک تھی۔ بھوک سے جان لبوں پر آگئی تھی۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن حذافہ کی استقامت کا اب بھی وہی حال تھا۔ کھانے کا کیا ذکر ہے۔ نگاہ اُٹھا کر بھی ان چیزوں کی طرف نہیں دیکھا۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے سامنے طلب کیا اور پوچھا کہ تمھاری غذا کے لیے جو کچھ بھیجا گیا ہے اُسے کیوں نہیں کھاتے ہو اس موقع پر حضرت عبداللہ ابن حذافہ نے جو ہمّت آفریں جواب دیا وہ قیامت تک ہر مسلمان کے لیے جراُت آموزی اور ہمّت آفرینی کا باعث رہے گا۔

اس صاحب عزم و ہمت نے بڑی بے باکی سے کہا۔ او بادشاہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اضطرار (مجبوری) کے ایسے درجے میں پہنچ چکا ہے جہاں حرام غذا بھی حلال ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر میں اسے کھانا چاہوں تو خدا کے یہاں مجھ سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تجھے اس خیال سے خوشی ہو کہ تو نے ایک مسلمان کو سور کا گوشت کھانے اور شراب کے پینے پر مجبور کر دیا اسلیے یہ غذا

نہیں کھا رہا ہوں۔

وہ حضرت عبداللہ ابن حُذافہ کی یہ ہمّت جرأت اور انکی یہ عدیم المثال استقامت دیکھ کر سناٹے میں آگیا۔ اب اُسے اُنھیں مزید ستانے کی جرأت نہ ہوئی اور چاہا کہ کسی بہانے سے رہا کر دے۔ کہنے لگا۔ اچھا اگر تم میرے سر کا بوسہ لو تو میں تمھیں رہا کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا کیا میرے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی رہائی حاصل ہو جائے گی۔ قیصر روم نے کہا۔ ہاں اگر تم میرے سر کو چوم لوگے تو سارے مسلمان رہا کر دیے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ نے بڑھ کر قیصر کا سر چوم لیا اور حسبِ وعدہ قیصر نے تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا۔ حضرت عبداللہ ان کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں تمام واقعات سنائے۔ حضرت عمرؓ ان کی استقامت اور خلوص سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ ــــــ عبداللہ ابن حُذافہ کے سر کا بوسہ لے اور میں سب سے پہلے اس فرض کو ادا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے حضرت عبداللہ کا سر چوم لیا۔ (تاریخ ابن عساکر)

○

بے نفسی کی حیرت انگیز مثال

اسلام نے اپنے پیرووں کو خدا کی مخلوق کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کی ایسی تعلیم دی ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔ اس بارے میں اسلامی قانون نے اس قدر زور دیا ہے کہ خود غرضی سخت جرم قرار پائی اور خدا کے بندوں کی خیر خواہی کے بغیر خدا پرستی میں کوئی خوبی باقی نہیں رہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے صاف کہہ دیا کہ:

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی یہ کیفیت نہ ہو جائے کہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنی ذات کیلئے پسند کرتا ہو

ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ وضاحت سے اس جانب توجہ دلائی اور صاف صاف کہہ دیا۔

الدین النصیحۃ

دین خیر خواہی کا نام ہے۔

اس تعلیم نے مسلمانوں کے دلوں میں دوسروں کی خدمت کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ دوسروں کو نظر انداز کر کے اپنی ذات یا اپنے اعزّا و اقربا کو فائدہ پہنچانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اس بارے میں ان کا احساس اتنا نازک تھا کہ آج خود غرضی اور مفاد پرستی کے دور میں اس کا تصور بھی دشوار ہے۔

اس سلسلے میں حضرت شیخ سقطی کا ایک واقعہ بہت ہی حیرت انگیز ہے عرصہ ہوا یہ واقعہ نظر سے گزرا تھا۔ اسے پڑھ کر اس وقت بھی حیرت ہوئی تھی اور اس کے بعد جب

بھی خیال آیا تو تعجب ہوا اور دل نے کہا کہ خدایا یہ تیرے کیسے پاک اور بے نفس بندے تھے۔ جنھیں ذاتی مفاد کے حصول کا کیا ذکر ہے اس کے ادنیٰ سے شائبہ سے بھی اس قدر شدید بیزاری تھی کہ اگر کہیں دوسروں کے مقابلے میں اپنا خیال آگیا تو ساری زندگی اس کی تکلیف محسوس کرتے رہے اور برابر توبہ استغفار کے بعد بھی مرتے دم تک دل اس کی یاد سے بے چین ہوتا رہا اور جب اس کا خیال آجاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ کلیجہ میں تیر لگ گیا ہے۔

حضرت سری سقطی تیسری صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ ہیں حضرت جنید بغدادی کے ماموں اور معروف کرخی کے شاگرد ہیں۔ بغداد میں قیام تھا ۲۵۱ھ میں وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

طبیعت میں بے نفسی اور بنی نوع انسان کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں اپنی کوئی اہمیت نہ سمجھتے تھے اور ان کو فائدہ پہنچانے کے لیے اپنے بڑے سے بڑے مفاد کو قربان کر دیتے تھے۔ پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اور مخلوق کی خدمت میں گزار دی۔ اس بارے میں ذرا سی لغزش کو بھی گناہ عظیم خیال کرتے تھے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ ان کی مجلس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا ذکر تھا لوگ الحمدللہ کے فضائل و مناقب بیان کر رہے تھے اور درجات و مراتب عالیہ کا ذکر کر رہے تھے جو الحمدللہ کہنے سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ لوگوں کی یہ گفتگو سن کر شیخ پر ایک عجیب حسرت و ندامت کی کیفیت طاری ہوئی۔ بڑے درد و غم کے ساتھ ٹھنڈی سانس لی۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ہاں بھائی ان فضائل و مناقب میں کیسے کلام ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف پر جو بھی ثواب حاصل ہو کم ہے اور اس سلسلے میں درجات و مراتب میں جتنی ترقی ہو تھوڑی ہے۔ الحمدللہ واقعی ایسا کلمہ ہے جس کے کہنے والے کو دنیا و آخرت میں سرخروئی و سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن میں ایسا بدنصیب ہوں کہ مراتب و درجات میں ترقی کا کیا ذکر ہے۔ الحمدللہ کہہ کر الٹا

ایسی سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا کہ برسوں سے اس کی تلافی کے لیے جد وجہد کر رہا ہوں لیکن طبیعت کی بے چینی میں ہنوز کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

تیس برس کی بات ہے ایک مرتبہ بغداد میں سخت آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا جس محلہ میں میری دکان تھی اس پر آگ کا غیر معمولی اثر ہوا۔ لوگوں نے آگ پر قابو پانے کی بہتیری کوششیں کیں۔ لیکن شعلے بڑھتے ہی گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں تقریباً سارا بازار جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ جہاں چند گھنٹے پہلے کروڑوں روپے کا سامان بھرا تھا اب وہاں تباہی و بربادی کی خاک اُڑ رہی تھی اور جو لوگ لاکھوں روپے کے محتاج تھے اب نان شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ جس وقت آتش زدگی کا یہ واقعہ پیش آیا میں بازار کے اس حصے سے بہت دُور تھا۔ اس لیے مجھے بر وقت کوئی اطلاع نہ ہو سکی۔ جب آگ بجھ گئی اور لوگوں کو اس طرف سے فرصت ہوئی تو میرے بعض احباب کو میرا خیال آیا۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اتنی سخت آتش زدگی کے باوجود میری دکان ایسی محفوظ تھی کہ اگر کوئی اس کو دیکھتا تو اسے خیال بھی نہ ہوتا کہ یہاں آگ لگی ہے میرے دوستوں اور ہمدردوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ انھوں نے اسے میرے حال پر اللہ تعالیٰ کی بڑی مہربانی سمجھا۔ ایک شخص دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور مجھ سے آگ لگنے کا سارا واقعہ بیان کیا۔ جس وقت وہ یہ حالات سُنا رہا تھا مجھے سخت پریشانی اور بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ آگ لگنا، اس کا پھیلنا، بازار کا اس کی زد میں آجانا، دکانوں کا جلنا، سب اس نے تفصیل سے بیان کیا۔ میں اضطراب اور تکلیف کے ساتھ یہ ساری خبر سُنتا رہا۔ آخر میں اس نے میری دکان کا حال سنایا اور کہا کہ لیکن اللہ تعالیٰ نے بڑی مہربانی کی۔ آپ کی دکان کے قریب شعلے پہنچ چکے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دم میں وہ بھی جل کر خاک ہوجائے گی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ آپ کی دکان بال بال بچ گئی۔ یہ اطلاع سن کر فرطِ مسرت میں میرے منہ سے نکلا۔ الحمدللہ۔ اس وقت اپنی دکان اور املاک کے بچ جانے کی خبر سے میرے

منہ سے یہ الفاظ نکل تو گئے۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دل نے کہا بدقسمتی تم بھی کتنے خودغرض ہو۔ اسلام تو ایثار اور بے غرض خدمت کی تعلیم دیتا اور یہ تاکید کرتا ہے کہ دوسروں کی تھوڑی تکلیف کو بھی بہت سمجھو۔ لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ دوسروں کی تباہی پر رنجیدہ اور غمگین ہونے کے بجائے تم اپنی سلامتی پر خوش ہو رہے ہو۔ سارا بازار جل گیا بڑے بڑے تاجر محتاج ہو گئے اور وہ لوگ جن کے یہاں لاکھوں کا ڈھیر رہتا تھا۔ اب دوسروں کے دست نگر ہیں۔ چاہیے تھا کہ تمہیں ان کی حالت پر ترس آتا اور اس مصیبت کا حال سن کر تم تڑپ جاتے۔ لیکن افسوس تمہاری قساوت قلبی کا یہ حال ہے کہ اپنی ایک دکان کے بچ جانے پر خوش ہو اور انا للہ کے بجائے تمہاری زبان الحمد للہ کہہ رہی ہے۔

دل کی اس سرزنش سے میں بے حد متاثر ہوا۔ وہ دن ہے اور آج کی تاریخ اس طویل عرصے میں مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ اس وقت کا الحمد للہ کہنا ہر وقت میرے دل میں پھانس کی طرح چبھتا رہتا ہے تیس برس سے میں برابر توبہ کرتا رہتا ہوں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا رہتا ہوں۔ اور اس کی بخشش کا طالب ہوں۔ لیکن اب تک اطمینان نہیں ہوا جب اپنی اس غفلت کی یاد آجاتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اور رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ قیامت میں خدا کو کیا جواب دوں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح آنکھیں چار کروں گا۔

مذکورہ بالا واقعہ کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں نہ اس پر کسی حاشیہ کی ضرورت ہے لیکن اس قدر کہنا شاید نامناسب نہ ہو کہ اسلاف کی اسی بلند نظری، سیرت کی پاکیزگی اخلاق کی خوبی، بے غرضی، بے نفسی اور مخلوق الٰہی کی خدمت کی لگن اور اپنے جذبات و مفاد کی قربانی کا اثر تھا جس نے تیزی سے اسلام کو ساری دنیا میں پھیلا دیا اور مسلمانوں کو تمام انسانوں کی نظر میں ایسا محبوب بنا دیا تھا کہ انھیں کی محبوبیت کے صدقہ میں ہم اس وقت زندگی کی سانس لے رہے ہیں۔ ورنہ اگر اسلاف کے یہ شاندار حیرت انگیز ایثار و خدمت کے

تذکرے نہ ہوتے اور ہمیں ان بے غرض و بے نفس بزرگوں سے نام کی نسبت نہ ہوتی تو شاید آج کوئی سورت دیکھنے کو روادار نہ ہوتا۔

وکیع بن الجراح ایک مشہور محدث ہیں، امام ترمذی اور دوسرے بڑے بڑے ائمہ ان کے شاگرد ہیں ان کی جلالتِ قدر کا یہ حال ہے کہ امام احمد بن حنبل رح فرماتے ہیں کہ میں نے علم حفظ خشوع اور ورع و تقویٰ میں وکیع کا جیسا کوئی اور آدمی نہیں دیکھا۔ خلیفہ مامون رشید کے قاضی القضاۃ یحییٰ ابن اکثم کا بیان ہے کہ مجھے سفر و حضر میں وکیع کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ دن کو روزہ رکھتے اور ہر رات ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ سرگروہ ائمہ جرح و تعدیل حضرت یحییٰ ابن معین بھی اسی طرح بیان دیتے ہیں، علم و فضل، عبادت و ریاضت اور زہد و تقوے میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی ان صفات کی بنا ء پر خلیفہ ہارون الرشید کی خواہش تھی کہ ان کو قاضی شہر مقرّر کرے۔ شہر کے ارباب صلاح کی یہی رائے تھی۔ سب نے خلیفہ کو رائے دی کہ وکیع کو منصب قضا سپرد کیا جائے خلیفہ نے اُنہیں بلا بھیجا اور کہا کہ مجھ پر حکومت اور عدل و انصاف کی جو ذمہ داری ہے میں چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کو بھی شریک کروں لیکن انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ میری ایک آنکھ کی روشنی جا چکی ہے دوسری بھی کمزور ہے اس لیے میں اس خدمت کو انجام نہ دے سکوں گا۔ اس واقعہ کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ کی اہمیت پورے طور پر سمجھ میں آجائے اور ان کی جلالتِ قدر نظر کے سامنے آجائے کہ علماء فقراء امراء سبھی ان کے گرویدہ تھے اور ان کی عظمت کا نقش سب کے دل پر قائم تھا۔ آج کسی کو یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو اس کے فخر و غرور کی کوئی حد نہ رہ جائے لیکن ان اساطین دین کی حالت ہی کچھ اور تھی وہ اپنے آپ کو بہت ہی حقیر سمجھتے تھے ان کی عبادت و ریاضت کا ذکر ہو چکا ہے کہ دن روزے سے گزرتے تھے اور راتیں نماز و مناجات میں بسر ہوتی تھیں۔ لیکن بایں ہمہ عبادت و ریاضت خدا کے سامنے اپنی کوتاہی عمل کا بہت زیادہ احساس تھا۔ ایک دن کسی شخص نے ان کی توہین کی اور بہت زیادہ سخت و سست کہا۔ آدمی بہت معمولی تھا شہر میں حضرت وکیع رح کا اتنا اثر تھا کہ اگر ذرا سا

اشارہ کر دیتے تو لوگ اس کا فیصلہ کر دیتے لیکن یہاں تو نقطۂ نظر ہی اور تھا۔ چپ چاپ سر جھکائے اس کی گالیاں سنتے رہے۔ پھر گھر کے اندر چلے گئے اور ایک گوشہ میں جاکر سجدہ میں گر گئے دیر تک زمین پر سر رکھے ہوئے تضرع وزاری کرتے رہے سارا چہرہ مٹی سے اٹ گیا تو بہ استغفار کے بعد باہر نکلے اور اس شخص کے پاس جاکر کہنے لگے۔ دیکھ گو اور برا بھلا کہہ کر اس کی اور توہین کر جس قدر تجھ سے ہو سکے اس کے ساتھ سختی سے پیش آ۔ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے اگر وہ خدا کا خطا کار نہ ہوتا تو تو اس پر مسلط نہ کیا جاتا۔

آپ نے دیکھا ہم میں اور ان بزرگان دین کی ذہنیت میں کتنا زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہمیں اگر کسی کے ہاتھوں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم خواہ قصوروار ہوں ـــــ لیکن اپنے کو بے قصور سمجھتے ہیں اور اس شخص کو مجرم اور گردن زدنی سمجھتے ہیں لیکن ائمہ دین پورے بری اور بے قصور ہونے کے باوجود اپنے ہی کو خطا کار سمجھتے تھے اور ناگوار تکلیف دہ موقع پر دوسرے کو موردِ الزام قرار دینے کے بجائے اپنے نفس محاسبہ کرتے تھے اور یہ سوچنے لگتے تھے کہ کہیں ہم سے خدا کی نافرمانی تو نہیں ہوگئی ہے ان کی اس شدت اجتناب نے ان کو خدا کا محبوب اور مخلوق کا مقتدی بنا دیا تھا یہی وہ بزرگ تھے جو دین کی اشاعت کا وسیلہ اور کتاب وسنت کی تعلیم وتلقین کا ذریعہ بنائے گئے تھے۔ تاکہ دین کے سرچشمے نفس کی گندگی اور جذبات کی آلودگی سے محفوظ رہیں اور کتاب وسنت کا صاف وشفاف پانی قیامت تک دماغوں کو پاک اور ذہنوں کو صاف کرتا رہے۔

خدا کرے یہ تذکرے مجلسی دلچسپی ہی تک محدود نہ رہیں بلکہ ہمارے دلوں کو متاثر کریں ـــ ہم بھی اپنے ان مقدس اور پر خلوص بزرگوں کے نقش قدم پر زندگی بسر کرنے لگیں تاکہ ایک طرف ہمیں عزت وسرخروئی حاصل ہو اور دوسری طرف اسلام کا پیام لوگوں کے دلوں میں گھر کرے۔

ایمان کی تاثیر

ذیل کی سطور میں ہم اسلامی عہد کے ایک اندلسی (اسپینی) فرماں روا معتصم بن صمادح کے عدل وانصاف کا ایک حیرت انگیز واقعہ درج کرتے ہیں جو ایک طرف انصاف ورعایا پروری کی ایک نادر مثال ہے اور دوسری طرف اس حقیقت کا برملا اعلان ہے کہ ایک مسلمان حکومت وسلطنت اور قوت واقتدار کے باوجود کبھی بھی پورے طور پر مطلق العنان نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ہمہ گیر ہمہ داں اور ہمہ بیں خدا پر یقین اور اس کی لامحدود عظمت وجلال اور اس کی بے پایاں قدرت وطاقت کا تصور اور اس کی مطلق العنانی کے لیے ہمیشہ رکاوٹ کا کام دیتا ہے۔ اور جزا وسزا کا یقین، آخرت کی باز پرس کا خوف دوزخ کا ڈر اور جنت کے حصول کی آرزو ہر قدم پر اسے ظلم وجور سے روکتی ہے اور عدل وانصاف ایمانداری وراست بازی اور نیکی وحسن سلوک کی ترغیب دیتی ہے

اندلسی مسلمانوں کو خوبصورت اور عالی شان عمارتوں کی تیاری کا جو شوق تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ آج اسپین سے ان کی حکومت کے خاتمہ کو سیکڑوں برس گزر چکے ہیں وہاں کے عیسائی باشندوں نے جس بری طرح ان کی ایک ایک چیز کو برباد کیا اور ان کے ایک ایک نشان کو مٹایا ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ لیکن اتنی شدید تباہی وبربادی کے باوجود آج صدیوں کے بعد بھی قرطبہ وغرناطہ کے کھنڈر ان کے ذوق تعمیر کے شاہد ہیں اور اپنے ہی نہیں بلکہ غیر بھی ان کی حیرت انگیز صناعی وکاریگری کو دیکھ کر حیرت زدہ ہیں۔

واشنگٹن ارونگ ہوں یا اسکاٹ موسیو سیدیو ہوں یا لیبان الحمرا کے در ودیوار اور مسجد قرطبہ کے ستون ومحراب کے حسن وجمال اور خوبی وکمال نے انھیں ایسا متاثر کیا کہ کھونے

مناقب و فضائل میں سیکڑوں صفحے لکھ ڈالے اور پھر بھی سیر نہیں ہوئے۔

معتصم نے اسی حسن آفریں اور جمال پرور فضا میں آنکھیں کھولی تھیں امیر المومنین عبدالرحمٰن الناصر کے پرشکوہ تذکرے کانوں میں گونج رہے تھے خلیفہ حکم کی علم پروری کی داستانیں سب کی زبانوں پر تھیں وزیر منصور ابن ابی عامر کی اولوالعزمی کے واقعات کا ہر جگہ چرچا تھا مسجد قرطبہ کا شاندار منظر نگاہوں کے سامنے تھا، قصر زہرہ کے حسن و جمال اور زیب و زینت کا ہر وقت ذکر ہوتا رہتا تھا باپ کے انتقال کے بعد جب معتصم سلطنت کا وارث ہوا تو علم دوستی کیساتھ اسے تعمیر کا بھی شوق ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ اپنے پایہ تخت المریہ میں ایک شاندار محل تعمیر کرے ایک قطعہ زمین کا انتخاب ہوا اور ماہرین فن کی نگرانی میں تعمیر شروع ہو گئی۔ جس جگہ محل تعمیر ہو رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی بعض یتیم لڑکوں کا باغ تھا جن لوگوں کو عمارت کی تعمیر کا کام سپرد کیا گیا تھا انہیں محسوس ہوا کہ جب تک یہ باغ بھی محل کے اندر شامل نہ کر دیا جائے گا اُس وقت تک پورے طور سے محل کا حسن و جمال نکھر نہیں سکتا ان لوگوں نے یتیم لڑکوں کے ولی سے درخواست کی کہ وہ اجازت دے دے کہ یہ باغ شاہی محل میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن متولی کسی طرح راضی نہ ہوا بادشاہی کارندوں کو یہ ضد ناگوار گزری اور اُنھوں نے زبردستی باغ پر قبضہ کر کے اسے محل کی حدود میں شامل کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد محل بن کر تیار ہو گیا اور بادشاہ معتصم نے اپنے باپ کے نام پر قصر صمادحیہ اس کا نام تجویز کیا۔ یتیموں کے باغ کے متولی کو شاہی کارندوں اور وزیروں کی اس جبری کارروائی سے سخت تکلیف پہنچی۔ لیکن ان کی قوت کے سامنے کیا کر سکتا تھا، بادشاہ کے حضور میں فریاد پہنچانے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے غم کھا کر بیٹھ رہا۔ لیکن ایک دن بادشاہ محل کے اندر تفریح کر رہا تھا۔ باغ کے اندر ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے دستر خوان بچھا ہوا تھا اور اکل و شرب کی محفل گرم تھی اس وقت یتیموں کے ولی کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی۔ جس کے ذریعہ وہ اپنی شکایت بادشاہ تک پہنچا سکتا تھا اس نے ایک ورق کاغذ لیا اور اس پر یہ عبارت لکھی۔

اے صاحب جب تو اس ورق کو ملاحظہ کرے تو اس واقعہ کو یاد کر جس کا اللہ تعالیٰ

نے ذکر کیا ہے (کہ ایک شخص نے حضرت داؤد کے سامنے اپنے بھائی کی شکایت کی
تھی) کہ میرے بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے
لیکن میرا یہ بھائی اس پر بھی زبردستی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بادشاہ بنایا زمین میں استحکام بخشا اور ہر طرح کی وسعت
فارغ البالی سے نوازا لیکن دنیائے فانی کی حرص نے پھر بھی تیرا پیچھا نہیں چھوڑا
اور تو نے اپنے وسیع اور عظیم الشان باغ میں چند یتیم بچوں کی زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی
شامل کر لیا اس ظلم سے تو نے اپنے حلال کو حرام کر لیا اور پاک چیز کو گندہ کر لیا ۔۔۔ اگر
سلطنت کے زور سے اور اپنی عظمت و شان کے اثر سے تو میرے مقابلے میں قادر ہے
اور مجھے تیرے سامنے ہونے کا یارا نہیں ہے تو کل ایسے حاکم کے سامنے اکٹھا ہوں گے
جس کے سامنے نہ کوئی حق چھُپ سکے گا نہ کوئی شکایت ضائع جائے گی۔

یہ عبارت کاغذ پر لکھ کر اس پر موم چڑھا کر ایک نلکی کی شکل میں اسے اس نہر
میں ڈال دیا جو باہر سے اندر کی طرف جا رہی تھی اور جس کے کنارے معتصم بیٹھا ہوا تھا جب
یہ نلکی بہتی ہوئی اُس کے سامنے سے گزری تو اس نے ملازمین کو حکم دیا کہ اسے نکال کر
پیش کریں۔ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور ملازم نے نلکی نکال کر بادشاہ کی خدمت میں
پیش کی۔ موم علاحدہ کرنے کے بعد جب کاغذ پر بادشاہ کی نظر پڑی اور اس نے وہ عبارت
پڑھی تو وہ بے انتہا متاثر ہوا اور ایسی خشیت طاری ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں سے
آنسو بہنے لگے ۔ تھوڑی دیر تک اس کی ایسی عجیب کیفیت رہی کہ لوگوں کو اندیشہ
ہوا کہ کہیں خوف الٰہی کی شدت سے دم نہ نکل جائے کچھ دیر کے بعد جب ہوش آیا تو حکم
دیا کہ فوراً وہ لوگ حاضر کیے جائیں جن کے سپرد محل کی تعمیر کی گئی تھی۔ جب وہ لوگ حاضر
ہوئے تو ان سے دریافت کیا کہ اس رقعہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے متعلق تمھاری کیا
رائے ہے۔ معاملہ سامنے آجانے کے بعد اقبالِ جُرم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا منتظمین
تعمیر نے اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ لیکن یہ عذر پیش کیا کہ اس ٹکڑے کے بغیر محل کی خوبصورتی
میں کمی رہتی اور دیکھنے والوں کو وہ بُرا معلوم ہوتا۔ اس جواب سے سلطان کو بہت

غصہ آیا اور اس نے کڑک کر کہا واللہ عیبھانی عینِ الخالقِ اَقبحُ مِن عیبھانی عینِ المخلوقِ (خدا کی قسم مخلوق کی نظر میں عیب دار ہونے کے مقابلے میں خالق کی نظر میں اس کا عیب کہیں زیادہ ہے۔) یہ کہہ کر فوراً حکم دیا کہ یتیموں کی زمین انھیں واپس کی جائے۔ خواہ محل کتنا ہی بدنظر ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس ٹکڑے کے نکل جانے کے بعد محل کی خوبصورتی کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن بادشاہ خوش تھا کہ اس نے خدا کی خوشنودی حاصل کرلی۔ عرصہ تک محل کی یہی حالت رہی ایک مرتبہ مریہ کے بعض سرآوردہ اصحاب محل کے پاس سے گزرے۔ جس جگہ سے یتیموں کا باغ علاحدہ کیا گیا تھا اس کا منظر دیکھ کر انھیں سخت افسوس ہوا۔ ایک شخص نے سلطان سے کہا کہ اس باغ کی علاحدگی سے اس محل کا حسین منظر بہت خراب ہو گیا۔ لیکن یہ گفتگو سلطان کو بہت ناپسند ہوئی اور اس نے ناگواری کے ساتھ کہا خاموش رہیے۔ یہی کونہ جسے آپ برا سمجھ رہے ہیں میری نظر میں اس محل کی زیب وزینت کا باعث ہے اور میں اسی کو اس محل کا بہترین حصہ سمجھتا ہوں۔ جب اس کی نظر محل پر پڑتی تو کہتا کہ ٹیڑھے حصہ کا منظر مجھے اس کے سیدھے اور صحیح حصّہ سے زیادہ محبوب ہے۔ (نفح الطیب)

اسی قسم کے خوف خدا کے واقعات تاریخ اسلام میں جا بجا نظر آتے ہیں چند واقعات اور ملاحظہ کیجیے۔

ملک شاہ سلجوقی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ مسلمان سلاطین کی صف میں اسے غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ قوّت وطاقت، اثر واقتدار، جاہ جلال شان وشوکت اور عظمت وجبروت کے اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے اولوالعزم بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کے معاصرین میں مشکل ہی سے کوئی ایسا بادشاہ ہوگا جو اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ بڑے بڑے حکمراں اس کی ادنیٰ نظرِ عنایت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ دنیا میں اُسے یہ حیثیت حاصل تھی کہ جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ لیکن بایں سطوت وجبروت اور قوت وطاقت کے باوجود اللہ پر ایمان اور آخرت کی باز پرس کے تصوّر نے اسے آزاد اور

مطلق نقصان نہیں ہونے دیا تھا۔ بلکہ قوت و اقتدار کے انتہائی مظاہروں کے موقع پر بھی جہاں آخرت کی بازپرس کا خیال آجاتا لرز جاتا اور مرضی الٰہی کے سامنے بے چون وچرا جھک جاتا۔

اس کے سوانح حیات کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار بڑی شان وشکوہ سے اس کی سواری نکلی۔ زبردست فوجی قوت ساتھ تھی، سپاہیوں اور سواروں کی زرق برق قطاریں ہمرکاب تھیں۔ جب شاہی سواری ایک پل پر پہنچی تو یکایک ایک بڑھیا نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑلی اور کہنے لگی۔ بتا میرا اور تیرا انصاف اس پل پر ہوگا یا اس پل (صراط) پر۔ ان الفاظ کو سن کر ملک شاہ بے چین ہوگیا، فوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور کہنے لگا۔ میاں اس پل صراط پر کھڑا ہونے کی تاب کسے ہے۔ بہتر ہے میرا اور تمہارا معاملہ اسی پل پر طے ہوجائے۔ بڑھیا نے بتایا سپاہیوں نے اس کی گائے پکڑ کر کھالی ہے اس کا معاوضہ دلایا جائے۔ سلطان نے تحقیق کی جب معاملہ صحیح نکلا تو بڑھیا سے معذرت کی۔ سپاہیوں کو سزا دی اور اس کی گائے کا پورا معاوضہ اسے دیدیا۔

ایک مرتبہ مجلس آراستہ تھی ایک خوش الحان عورت گانا سنانے لگی عورت کے حسن وجمال اور اس کی خوش آوازی و دلکشی نے سلطان کو بے حد متاثر کیا، شیطان نے دل کے اندر گناہ کا جذبہ پیدا کیا بے اختیار ہوکر اس عورت کی طرف متوجہ ہوا، قریب تھا کہ ہاتھ آگے بڑھے اور عورت کے جسم تک پہنچ جائے۔ لیکن عین اسی عالم میں عورت نے کہا۔ شاہا! ناز ونعمت کا پلا ہوا یہ جسم اور اس کا یہ حسن وجمال آگ میں جلنے کے قابل نہیں ہے۔ حرام وحلال کے درمیان صرف دو بول کا فرق ہے۔ ان الفاظ کا کان میں پڑنا تھا کہ سلطان کی حالت دگرگوں ہوئی۔ آخرت کے بازپرس کے خوف نے سارے جسم میں کپکپی پیدا کردی، گناہ کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے اور ناجائز طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اس عورت سے باضابطہ نکاح کرلیا۔

ایک مرتبہ اس کی خدمت میں کہیں دور دراز سے دو آدمی حاضر ہوئے۔ انھوں نے

شاہی حاکم کے ظلم کی شکایت کی اور عرض کیا کہ جہاں پناہ اس نے ہم غریبوں کو بے حد
پریشان کیا ہے۔ ہماری جایئداد چھین لی ہے اور زبردستی املاک ضبط کرلی ہے ملک
شاہ اس اطلاع سے سخت پریشان ہوگیا اسے ایسا نظر آیا کہ وہ میدان قیامت میں
کھڑا ہے اور حکم الحاکمین کی عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ دائر ہے اس نے ان
دونوں آدمیوں سے کہا تم دونوں میں سے ایک میری داہنی آستین پکڑے اور دوسرا
بائیں آستین پکڑے اور مجھے کھینچتے ہوئے اس طرح وزیر اعظم نظام الملک طوسی کے پاس لے
چلو۔ وہ آدمی اس عجیب وغریب فرمائش کو سن کر سناٹے میں آگئے انھوں نے
عرض کیا۔ عالی جاہ! ہم غریبوں کی اتنی جرات کہاں ہوسکتی ہے کہ آپ کے ساتھ اس
طرح پیش آئیں۔ لیکن سلطان نے اصرار کیا اور انھیں تاکید کی کہ اس حکم کی تعمیل
کریں۔ مجبوراً ایک شخص نے داہنی آستین پکڑی اور دوسرے نے بائیں آستین پکڑی
اور کھینچتے ہوئے نظام الملک کے مکان کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب بادشاہ اس
حال میں وزیر کے مکان پر پہنچا تو دیکھنے والے گھبرا کر نظام الملک کے پاس پہنچے
اور اسے بادشاہ کی اس طرح تشریف آوری کی اطلاع دی۔ نظام الملک یہ عجیب
وغریب خبر سن کر حیرت زدہ ہوگیا اور گھبرا کر باہر نکلا۔ باہر نکل کر دیکھا تو واقعی بادشاہ اس
طرح آرہا ہے کہ اس کے دائیں اور بائیں دو آدمی ہیں جو اس کی آستینیں پکڑ کر گھسیٹ
رہے ہیں نظام الملک حیرت واستعجاب کی تصویر بنا ہوا دوڑ کر حاضر خدمت ہوا اور ہاتھ
جوڑ کر عرض کی مولائے عالم یہ کیا حال ہے۔ وزیر کی یہ بات سن کر ملک شاہ نے کہا۔
"نظام الملک میں نے حکومت کی ذمہ داری اس لیے سپرد کی تھی کہ تم ملک
کے تمام حصوں پر نظر رکھو گے۔ تم اور تمھارے ماتحت رعایا کے ساتھ شفقت ومحبت
کا برتاؤ کریں گے اور ساری مملکت میں عدل وانصاف کی فرماں روائی ہوگی لیکن
مجھے یہ معلوم کرکے بے حد صدمہ ہوا کہ تمھارے ماتحت رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے
پیش نہیں آتے۔ بلکہ ان پر ظلم کرتے ہیں۔ آج یہ لوگ تمھارے ایک ماتحت کی شکایت
لے کر آئے ہیں۔ اگر یہی صورت رہی اور عدل وانصاف کے بجائے تمھارے کارندے

رعایا کے ساتھ ظلم دستم کا برتاؤ کرتے رہے تو کل میں خدا کو کس طرح منہ دکھاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میں قیامت کے دن اس طرح اس کے سامنے حاضر کیا جاؤں کہ میرے گرد و پیش مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ جمع ہوں اور داورِ حشر کے سامنے انصاف کے طالب ہوں۔ میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ میدانِ حشر میں لوگوں سے جواب دہی کر سکوں، اس لیے اس معاملے کو جلد طے کرو، اس کے حکم کے مطابق نظام الملک نے فوراً ان لوگوں کی داد رسی کی۔ ملک شاہ کی پوری زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور ملک شاہ پر کیا منحصر ہے کتنے ہی سلاطین ہیں جو خدا کے خوف اور آخرت کی بازپرس کے خیال سے لرز جاتے تھے۔

سلطان شمس الدین التمش تاریخ ہند کا ایک نیک نام بادشاہ ہے۔ مورخین اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ لیکن اس کی نیکی اور عدل گستری اس کے مذہبی جذبہ کی رہین منت ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے اسکی نظر میں مذہب کو ایک زندہ حقیقت بنا دیا تھا۔ خدا کے سامنے جوابدہی اور آخرت کے محاسبہ کا خیال ہر وقت اُس کے دل میں رہتا تھا اسو جہ سے وہ ہر وقت رعایا کی دیکھ بھال اور انکی راحت و آرام کی فکر میں لگا رہتا تھا لیکن اتنا کچھ کرتے رہنے کے بعد بھی اُسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ رعایا کی دیکھ بھال میں اگر اِس سے ذرا بھی فروگذاشت ہوگئی تو خدا کو کیا جواب دے گا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا بیان ہے کہ ایک رات میں پچھلے پہر کے وقت دیکھتا کیا ہوں کہ سلطان خانقاہ میں آ رہا ہے آتے ہی میرے پیروں پر گر پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔ میں نے اُٹھا کر بٹھایا اور پوچھا کہ آخر اس بیقراری کا کیا سبب ہے تھوڑی دیر تک فرطِ گریہ سے آواز نہ نکل سکی۔ جب ذرا سکون ہوا تو سلطان نے روتے ہوئے کہا۔ سلطنت کی ذمہ داری سخت ہے۔ ہر قسم کی جد و جہد کے بعد جس وقت آخرت کا خیال آجاتا ہے اور خدا کے سامنے جواب دہی کا تصور کرتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں کہ کس طرح سے نجات حاصل کر سکوں گا۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت تسکین دی۔ سلطان نے کہا۔ حضرت! میں نے اس دنیا میں آپ کا دامن پکڑا ہے جس طرح آج آپ میری دستگیری کرتے ہیں اسی طرح کل آخرت میں میری مدد کیجیے گا۔ خدا سے دعا

کیجیے کہ وہ مجھے اس امتحان میں کامیاب کرے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے جب بہت تسکین دی تب جاکر قرار آیا۔

سلطان کی اس تاثیر کی قدر پورے طور سے اس وقت واضح ہوتی ہے، جب اس کی ذاتی زندگی پر نظر ہو۔ امور سلطنت کی ایمان داری کے ساتھ بجاآوری کے ساتھ اس کی ذاتی عبادت و ریاضت کا یہ حال تھا کہ اس کے معاصرین میں کسی کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا۔ ساری زندگی میں کبھی نماز باجماعت فوت نہیں ہوئی۔ اس کا حال اس وقت سب پر ظاہر ہوا جب حضرت خواجہ صاحب کا انتقال ہوا۔ نماز جنازہ کے لیے آپ کے خادم خاص نے اعلان کیا کہ حضرت کی وصیت ہے کہ ان کی نماز جنازہ وہ پڑھائے جو کبھی بدکاری کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ (۲) جس کی تکبیر اول کبھی فوت نہ ہوئی ہو۔ جس نے کبھی عصر کی سنتیں ترک نہ کی ہوں۔

اس اعلان سے سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کسی نے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کی تو سلطان شمس الدین نے نماز پڑھائی اور فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ میری حالت کی شہرت نہ ہو اس لیے مجھے آگے بڑھنے میں تامل تھا۔ لیکن جب کوئی اس صلاحیت کا نظر نہیں آیا تو حضرت خواجہ کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے آگے بڑھنا پڑا۔

(ملفوظات خواجہ کاکی)

آپ نے دیکھا کہ مذہب کے اثر نے ایک مطلق العنان بادشاہ کی انفرادی اور اجتماعی سیرت کو بہتر بنا دیا تھا۔ آج اس دور میں اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔

○

نئی اور اہم مطبوعات

مفتی صدرالدین آزردہ	پرواز اصلاحی	۱۲/۰
اُردو گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	۱۴/۰
مسلمان اور وقت کے تقاضے	مولانا عبدالسلام قدوائی	۸/-
انشائیات	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۵/-
فسانۂ غالب	مالک رام	۱۶/۵۰
تذکرۂ معاصرین دوم	مالک رام	۱۴/-
حیاتِ اسماعیل میرٹھی	ڈاکٹر سیفی پریمی	۱۸/-
نوائے آوارہ	غلام ربانی تاباں	۸/۵۰
کربِ آگہی	آنند نرائن مُلّا	۱۰/۵۰
کو بہ کو	سلمان اختر	۶/-
تعلیم اور سماج	سعید انصاری	۵/-
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	۸/-
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۳/-
گاندھی بابا کی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۴/-
دلّی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن	۶/-
ذکرِ غالب	مالک رام	۱۵/-
رموزِ غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
میر انیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۴/-
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	۱۰/۵۰
جدید اُردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۳/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نرائن مُلّا	۱۶/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	محمود الحسن	۱۵/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ۔ عبداللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
اُردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۴/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	۶/-
بیاضِ مریم	سکندر علی وجد	۱۲/-
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۳/-
سماجی تبدیلیاں ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں	رام شرن شرما	۲/-
قدیم دلّی کالج	مالک رام	۴/۵۰
انتخاب حالی	مرتبہ۔ سفارش حسین رضوی	۹/۵۰
یادوں کے سائے	عتیق صدیقی	۱۸/-
تلاشِ میر	نثار احمد فاروقی	۱۱/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
مذہب اور جدید ذہن	ڈاکٹر مشیر الحق	۶/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۱۳/۵۰
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹/-

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی 110002